دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ

13 10/1966

ماہنامہ الحق

زیرِ سرپرستی: شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور (مغربی پاکستان)

لہٗ دعوۃ الحق

قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

الحق

اکوڑہ خٹک

اس شمارے میں

صفحہ	مضمون نگار	مضمون
۲	مولانا سمیع الحق	نقش آغاز — ضرورت دین
۸	علامہ شمس الحق افغانی	ڈاکٹر فضل الرحمان اور ان کے تحقیقاتی فلسفے
۱۰	مولانا محمد یوسف (ماموں کانجن)	چند ہفتے دیار عرب میں
۲۶	مولانا عبد اللہ کاکاخیل	سوشلزم اور اسلام کا اقتصادی نظام
۳۱	مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ	چند لمحے مجلس اولیاء میں
۳۷	مولانا محمد اسحاق بھٹی۔ لاہور	موجودہ دینی انحطاط اور اسکا بڑا سبب
۴۰	مولانا محمد اشرف ایم اے	اسلام متجددین کے نرغے میں
۴۶	ٹیپ کے بند	مجلس معارف القرآن (دیوبند)
۴۸	مولانا محمد سالم قاسمی	یکجات اقوال
۵۲	سیدنا حضرت علیؓ	تبصرہ کتب
۵۵	ادارہ	احوال و کوائف دار العلوم
۵۷	ادارہ	الحق کا ذکر خیر
۶۲	الجمعیۃ دہلی۔ دار العلوم دیوبند	

[illegible]

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے اگر آنجناب اس علمی دینی اور تبلیغی رسالہ کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ تو آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمادیں۔ اگر خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمادیں۔ جواب نہ آنے پر اگلا شمارہ بذریعہ وی۔ پی ارسال ہوگا جس کا وصول کرنا آپ کا قانونی اور اخلاقی فریضہ ہوگا۔

جلد نمبر ۲ | شمارہ نمبر ۱ | جمادی الثانی ۱۳۸۶ھ | اکتوبر ۱۹۶۶ء

کتابت: اصغر حسن

سمیع الحق استاذ دار العلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

نقشِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذشتہ مہینے مصر کے ممتاز عالم، مفکر اور دینی اقدار کے بلند حوصلہ داعی استاد سید قطب اور ان کے رفقاء کی شہادت کا سانحۂ فاجعہ پیش آیا۔ صدر ناصر اور ان کی فوجی عدالت نے انہیں پھانسی پر لٹکایا۔ ان لوگوں نے صبر و استقامت سے دار و رسن کے مراحل طے کئے اور اپنی جانیں رفیقِ اعلیٰ کے سپرد کیں رحمہم اللہ و ارضاھم۔ اس سانحۂ ہائلہ کے حقیقی اسباب و محرکات ابھی تک سامنے نہیں آسکے مگر اتنی بات واضح ہے۔ کہ عالمِ اسلام کی اکثریت ان پر لگائے ہوئے الزامات سے مطمئن نہیں ہو سکی، جن لوگوں کا وجود عالمِ اسلام کے لئے مشترکہ متاع اور گرانمایہ سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ ان کے ساتھ اس طرح کے سلوک پر عالمِ اسلام کا اضطراب ایک لازمی اور طبعی امر ہے۔ کہ مسلمان ہر درد و مصیبت میں ایک دوسرے کے لئے "جسدِ واحد" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اذا اشتکی عضو منہ (الحدیث) اگر واقعی یہ لوگ ملکی مصالح سے غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔ تو پھر بھی انکی ہمہ گیر مقبولیت کی بنا پر ضروری تھا۔ کہ ان کا کیس کسی غیر جانبدار یا مشترکہ ٹریبونل میں پیش ہوتا۔ یا کم از کم انہیں اپنی صفائی کا موقع دیا جاتا۔ اگر ایک جماعت یا تحریک برسرِ اقتدار گروہ سے مطمئن نہ ہو اور وہ اسے بدلنا چاہتی ہو تو جمہوریت کے اس دور دورہ میں محض اس جرم کی بناء پر اسے گردن زدنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ سامراج اور استعمار کے مقابلہ میں صدر ناصر کی کوششیں لائقِ تحسین و تائید ہیں۔ ہم سامراجیت علی الخصوص مغربی استعمار کو اس دور کا بدترین المیہ اور شجرۂ ملعونہ سمجھتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ خدا فراموش قومیت مذہب بیزار اشتراکیت یا سیکولرزم کو ہرگز گوارہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ مذہب بالخصوص اسلامی اقدار کے احیاء و فروغ کو استعمار و استبداد کی بیخ کنی کی راہ میں ایک رکاوٹ سمجھتے ہیں، وہ صریح غلطی پر ہیں۔ قوم و وطن سے بالاتر اور اسلامی اقدار کا علمبردار ہو کر بھی تو کافرانہ استبداد و استعمار کو للکارا جا سکتا ہے۔ بلا شبہ یورپی استعمار اور سامراجیت کی بندشوں سے کلی طور پر آزاد ہونا عالمِ اسلام کا اقدم اور اہم ترین فریضہ ہے لیکن اگر اس لعنت کی جگہ مصر کی اشتراکیت (خواہ اسے سوشلزم

کے معنی میں نہ لیا جائے۔) یا سیکولرزم یا کوئی اور غیر اسلامی نظام اپنا قدم جماتا ہے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ دین اور مذہب کو سماجی، اقتصادی اور معاشی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔ تو ہم اس متبادل نظام کو بھی ایک لعنت ہی سمجھیں گے۔ اس صورت میں مغربی سامراج کے جنازہ نکلنے پر ہمیں خوشی تو یقیناً ہوگی۔ مگر وہ صرف سلبی پہلو ہوگا۔ اور محض ایسی خوشی جو ویت نام، کیوبا یا کانگو کی آزادی اور فیڈرل کاسٹرو یا ہوچی منہ اور لومبا کے کارناموں پر حاصل ہو۔ ایک مسلمان کو کامل خوشی تو صلاح الدین ایوبیؒ کے مومنانہ فتوحات سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو نہ صرف صلیب کے علمبرداروں کو بلکہ صلیبی نظام کو بھی توڑ کر رکھ دے۔ مصطفیٰ اتاترک کی فتوحات اور کارناموں پر خوشی کا چراغاں ضروری تھا۔ لیکن تصویر کا وہ روح فرسا اور ایمان سوز رخ بھی نظروں کے سامنے رہنا ضروری تھا۔ جس کے نتیجہ میں ترکیہ سے اسلام اور دین محمدی کو جلاوطن کیا گیا اور محمدی اقدار کا نام لینا ناقابل معافی جرم قرار پایا ایک دن خوشی کے نقارے بج گئے۔ مگر نصف صدی بلکہ آج تک ملت مسلمہ ترکیہ میں اسلام کی غربت پر رو رہی ہے۔ افسوس کہ جذبات کی شدت میں یہ تلخ ترین پہلو نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ عالم اسلام کی بعض قیادتیں مغربی استعمار سے لڑ رہی ہیں۔ اور بعض مشرقی استبداد (سیکولرزم یا دہریت) سے برسرپیکار ہیں۔ مگر جس گرمجوشی سے یہ مقابلے ہو رہے ہیں اس سے زیادہ شوق اور ولولہ سے اپنے دشمن (سامراج یا سیکولرزم) کے معاشی، سماجی اقتصادی اور ان کی تہذیب و تمدن، نظریات، عادات و اطوار سے معانقہ کیا جا رہا ہے۔ (ہمارے عرب بھائی تو اس معاملہ میں خاصے تیز ہیں۔) محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لائے ہوئے طرز زندگی کو جاہلیت عصر حاضرہ (مغربی تہذیب اور مادیت) کے بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ یورپی اقوام اور بیرونی اقتدار کے تو دشمن ہیں۔ مگر خود سرتاپا انہی کے رنگ میں ملک و قوم کو ڈبو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ مصالحت کی رو میں وہ اپنے دینی مسلمات، متوارث اور قطعی اقدار سے انحراف اور اس میں تبدیلی و ترمیم سے بھی نہیں شرماتے ان حالات میں مسلمانوں کا یوں ایک دوسرے کو مشق ستم بنانا ایک دوسرے کو گردن زدنی قرار دینا ہرگز قابل ستائش نہیں ہو سکتا۔ صدر ناصر اگر مغربی استعمار سے برسرپیکار ہیں، تو سید قطب اور ان جیسے دیگر علماء و دعاۃ مغربی تہذیب و تمدن سے ایک سیاسی محاذ پر لڑ رہا ہے۔ اور دوسرا علمی اور دینی محاذ پر۔ اس واقعہ فاجعہ نے مسلمانوں کے علمی محاذ کو ایک بلندپایہ عالم مصنف، ادیب، مفکر اور داعی سے محروم کر دیا۔ تو سیاسی محاذ پر صدر ناصر کی مقبولیت اور انصاف پسندی کو

بھی شدید نقصان پہنچایا۔ اور یہ دونوں باتیں عالم اسلام مسلمانوں، عربوں، حریت پسند اقوام اور سامراج دشمن عناصر کے لئے فال نیک نہیں ہیں —— اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حالت زار پر رحم فرمائے۔

مرکزی وزیر قانون مسٹر ایس ایم ظفر صاحب نے ایک پریس کانفرنس میں انکشاف کیا کہ حکومت اسلامی تحقیقاتی ادارہ" (اسلامک انسٹی ٹیوٹ) کے ذریعہ اسلامی قوانین و احکام سے متعلق ایک جامع کتاب مرتب کروا رہی ہے۔ یہ کتاب چار سال کے اندر مکمل ہو کر عدالتوں کی رہنمائی کیلئے استعمال ہو سکے گی۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس جامع اور اساسی کتاب میں جدید علماء کے افکار کو بھی جگہ دی جائیگی۔ جہاں تک اسلامی قوانین کے ترتیب و تدوین کا سوال ہے، ہم اسکی ہر لحاظ سے تحسین کریں گے۔ کیونکہ پاکستان بجائے خود منزل نہیں بلکہ حصول مقصد (اسلامی نظام اور کتاب و سنت کے نفاذ) کا ذریعہ ہے۔ اور جتنا بھی جلد ہو سکے، اس ملک میں کتاب و سنت کی حکمرانی اور انہی بنیادوں پر اسلامی معاشرہ برپا ہونا چاہئے۔ لیکن اسلامی قانون" پر مشتمل یہ کتاب اگر اس" اسلامی تحقیقاتی ادارہ" کے ذریعہ مدون ہو جس کا مشغلہ آج تک دین کے مسلمات سے تلاعب، تمسخر اور اسے مشق مسخ و تحریف بنانے کے سوا کچھ نہیں رہا۔ تو اسلامیان پاکستان اسے ہرگز قبول نہیں کر سکیں گے۔ ان "جدید علماء محققین" کے مشاغل و عزائم کی کچھ جھلکیاں ہم وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس ادارہ کے "شہرہ آفاق محقق" ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا اصل روپ بھی اب مسلمانوں سے مخفی نہیں رہا —— یہ بات بالکل واضح اور قطعی ہے۔ کہ مسلمانوں کو وہ اسلام درکار ہے، جو محمد عربی علیہ السلام سے خلفائے راشدین، صحابہ کرامؓ، تابعین، ائمہ اربعہ (ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ، مالکؒ) غزالی، رازی اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہم اللہ کی وساطت سے پہنچا۔ وہ اسلام ہرگز نہیں جو عیسائی اور یہودی مستشرقین، شاخت، اسمتھ، اور گولڈ تسیہر اور ان کے شاگردان رشید پیش کریں۔ ہم مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کا اسلام چاہتے ہیں۔ نہ کہ میکگل اور برطانیاں کی یونیورسٹیوں کا۔ اگر واقعی ....ت اسلامی قوانین اور اسلامی اقدار کا نفاذ چاہتی ہے تو یہ کام ہرگز ایسے اداروں سے نہ ہو سکے گا۔ جن کے مساعی کا نتیجہ سوائے ضیاع وقت و سرمایہ کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ اور جن کی تحقیقات مسلمانوں کی مزید دل شکنی اور نظریۂ پاکستان سے انحراف، باہمی تفریق و انتشار اور پاکستان کی سالمیت کو نقصان کا باعث بن رہی ہیں۔ —— اگر صاف دلی اور اخلاص سے اسلام کی بالاتری گوارا اور مطلوب ہے تو اس اسلام کو، اس

اسلامی قانون کو میدان میں لائیے جسکی صداقت اور سچائی پر چودہ سو سال سے مسلمانوں کا ایمان ہے۔ نہ وہ اسلام جو بیسویں صدی کے مغرب زدہ ٹیڑھے دماغ اور گمراہ قلوب کی پیداوار ہے اور اگر اس قسم کے اعلانات اور منصوبوں سے محض دفع الوقتی مقصود ہے۔ تو خدارا اسلام کو ماڈرن بنانے اور اس کا حلیہ بگاڑنے کا یہ مشغلہ بند کروا دیجئے۔ ہمیں یقین ہے جس خدا نے "اسلام" کو تاقیامت پسندیدہ دین قرار دیا وہ اسکی حفاظت بھی کر سکے گا۔ وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم۔

افسوس کہ بزم قاسمیؒ اور محفل شیخ الہندؒ کی ایک ایک شمع خاموش ہوتی جا رہی ہے۔ برطانوی سامراج کے استیصال اور مسلمانوں کی دینی و فکری قیادت کیلئے دارالعلوم دیوبند نے جو لشکر جرار تیار کیا اس کا ایک ایک اولوالعزم سپاہی اٹھتا جا رہا ہے۔ کچھ خال خال نظر آرہے ہیں، وہ بھی آمادہ رحیل ہیں۔ ان جانسپاران ملک و ملت اور موجودہ نسلوں کے درمیان بیچ کی یہ کڑیاں بھی نکل جائیں گی۔ مگر آنے والوں کے لیئے ان لوگوں کی قربانیوں سے بھرپور اور تابناک زندگی روشنی کے مینار کا کام دے سکے گی۔ حضرت مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی مرحوم کا وجود بھی انہی ارباب عزیمت اور علمبرداران حق علماء میں سے تھا، جن کا پچھلے ماہ بالاکوٹ (ہزارہ) میں انتقال ہوا۔ تدفین بھی اس پاکیزہ سرزمین میں ہوئی جو سیدین شہیدین (امیر المومنین سید احمد شہیدؒ اور سیدنا شاہ اسماعیل شہیدؒ) کے خون شہادت سے لالہ زار بنی تھی۔ مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی جید عالم، بہترین و بے بدل خطیب تھے۔ زندگی بھر ہر دینی و ملی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ خواہ استخلاص وطن کی تحریک ہو یا ختم نبوت کا مسئلہ تقسیم سے پہلے جمعیۃ العلماء ہند اور تقسیم کے بعد جمعیۃ العلماء اسلام میں نمایاں کام کیا کیسی ہی نازک گھڑی ہو حق کہنے سے کبھی دریغ نہ کیا۔ لایخافون فی اللہ لومۃ لائم۔ ان کا شیوہ رہا۔ وہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمدؒ مدنی کے جان نثار خادم اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے نہ صرف تلمیذ بلکہ منظور نظر رہے۔ مولانا کے قیام لاہور کے دوران حضرت شاہ صاحب مرحوم نے بارہا انہیں میزبانی اور استفادہ میں رفاقت کا شرف بخشا۔ دارالعلوم حقانیہ کے لیئے تو مولانا کی وفات ایک مخلص اور سرگرم رکن کی جدائی ہے۔ ابتداء تاسیس ہی سے دارالعلوم کی ترقی میں ہر طرح حصہ لیتے رہے، سوفاق و جاہت کے استعمال سے بھی گریز نہ کیا۔ ان کی زندگی کے یہ مختلف ادوار اس حقیقت

کے غماز ہیں۔ کہ ان کا دل دینی تڑپ اور قوم وملک کی حقیقی اصلاح اور ملی جذبات سے معمور تھا۔ ایسے حضرات کا ایسے دور میں اٹھ جانا ایک المناک سانحہ ہے۔ حق تعالیٰ امتِ مرحومہ کو مرحوم کا نعم البدل اور مرحوم کو درجاتِ عالیہ سے نوازے۔

ابھی چند روز قبل ایک ایسی پاک طینت اور راسخ الایمان خاتون بھی انتقال فرماگئیں جنکی زندگی عصر حاضر کی مسلمان خواتین کے لئے روشنی کا مینار اور ایک بہترین نمونہ بن سکتی ہے۔ یہ سراپا ایمان خاتون اسیر مالٹا حضرت مولانا عزیز گل صاحب کاکاخیل، تلمیذِ خاص حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی اہلیہ محترمہ تھیں جنہوں نے برطانیہ کے ایک ممتاز اور ذی ثروت خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ اس خاندان کا مذہب عیسائیت تھا۔ اس گھر کے اکثر افراد اونچے اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ برصغیر کے انگریز کمانڈر انچیف لارڈ کچنر اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سکندر حیات کے زمانہ کے انگریز گورنر بی جے گلانسی سے اسی خاتون کی چھوٹی بہن منسوب تھی۔ مگر خود ان کے دل میں تلاشِ حق کا جذبہ تھا۔ وہ بچپن سے انجیل اور عیسائی مذہب سے مطمئن نہ تھیں، حق کی جستجو میں انہوں نے کئی مذاہب کی چھان بین کی شوقِ حق کا یہ جذبہ انہیں ہندوستان لے آیا۔ یہاں انہوں نے بدھ مذہب کو اپنایا، پھر سادھوؤں کی طرح دنیا سے کنارہ کشی کی۔ ریاضتوں اور شدید مجاہدوں میں ایک وقت گزارا۔ بالآخر انہیں قرآن کریم کی شکل میں وہ نسخۂ شفا مل گیا جسکے لئے وہ سرگرداں تھیں۔ اسلام نے ان کے مضطرب دل و دماغ کو اطمینان بخشا، وہ مسلمان ہوئیں اور ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء میں ایک دینی مرکز دارالعلوم دیوبند کا شہرہ سن کر دارالعلوم دیوبند آئیں، اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کی مجلس میں اپنے اسلام اور مومنانہ اثرات کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یورپ کی تمام آسائشوں، ایک آسودہ حال خاندان، اور اپنے ملک وطن کو اسلام کی راہ پر قربان کیا۔ اللہ کی راہ میں ہجرت کے لئے انہوں نے اپنی اولاد تک کو بھی عمر بھر کے لئے خیرباد کہا جو ان کے انگریز شوہر سے تھی، اور یکسوئی سے اسلامی تعلیمات کے حصول میں لگ گئیں۔ حضرت مولانا عزیز گل صاحب مدظلہٗ کی سابقہ اہلیہ (جو حضرت شیخ الہندؒ کی نواسی تھیں) کے انتقال کے بعد حضرت مدنیؒ اور دوسرے اکابر کے مشورہ پر ۱۹۳۶ء میں اس پاکباز خاتون کا نکاح حضرت مولانا عزیز گل صاحب کے ساتھ ہوا۔ اور اس وقت سے لیکر اب تک ساری زندگی ایک ایسے دور افتادہ گاؤں (جسکی آبادی بمشکل ۳۰۔۔۴۰ افراد کی ہوگی) میں بسر کی جو یورپ تو کیا اس ملک کی عام

آسائشوں سے بھی محروم تھا۔ اعزہ و اقارب کے تقاضوں کے باوجود آخر دم تک ظلمت کدۂ یورپ کو چند دن کے لئے بھی جانا گوارا نہ کیا۔ ان کی زندگی حضرت مولانا کے ساتھ ایک متوسط بلکہ کفاف کی زندگی تھی، زندگی بھر ان کا مشغلہ قرآن مجید کا مطالعہ اور اس میں غور و فکر رہا۔ شادی کے بعد انہوں نے حضرت شیخ الہند مرحوم کے ترجمہ کی روشنی اور مولانا عزیز گل کی رہنمائی میں قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ مکمل کیا، جسے اس وقت کے مشاہیر علماء سید سلیمان ندویؒ اور دیگر حضرات نے بے حد پسند کیا۔ مگر افسوس کہ ناشرین کی سرد مہری کی وجہ سے اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ معلوم ہوا ہے۔ کہ لاہور کے فیروز سنز والوں نے اسکی اشاعت کی ذمہ داری لی ہے۔ نمونہ کے طور پر اس کا پروف بھی چھپا تھا۔ مگر ان کی بے اعتنائی کی وجہ سے یہ ترجمہ تاحال منظر عام پر نہیں آ سکا ـــــ مرحومہ نے (جو بعد اسلام مُدر (ماں) کے نام سے مشہور تھیں) اسلام کی حقانیت اور دیگر مذاہب کے ساتھ اس کے موازنہ پر ایک کتابچہ بیلنس وے (BALANCE WAY) بھی لکھا ہے۔ قرآن کریم کی اشاعت کی تڑپ کا یہ عالم تھا۔ کہ مرتے وقت بھی وصیت کی کہ ان دیہاتی عوام کو پورے قرآن کریم کا ترجمہ اور مفہوم سمجھا دیا جائے۔ علم اور فضل خدا کی دین ہے۔ اور وہ چاہے تو اس دولت سے عورتوں کو بھی سرفرازی بخش دیتا ہے۔ روشنی کے یہ چراغ کبھی مردوں کی شکل میں جلے تو کبھی عائشہؓ اور رابعہؒ کی شکل میں ـــــ روشنی بہر حال روشنی ہے۔ اور اسے منزل و مقصد کا ذریعہ بننا چاہیئے۔ مرحومہ نے عیسائیت سے بیزاری، پھر اللہ کی راہ میں ملک و وطن، مال و اولاد اور عمر بھر کی عیش و راحت کی قربانی قرآن کریم سے شغف اور انہماک کا ایک نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ جو ہم سب کے لئے ایک نصیحت اور قابل تقلید اسوہ ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق

الحق کے مندرجہ ذیل پرچے درکار ہیں

دفتر کو مندرجہ ذیل شماروں کی شدید ضرورت ہے۔ مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔ اکتوبر ۶۵ء نومبر ۶۵ء جنوری ۶۶ء فروری ۶۶ء اپریل ۶۶ء ـــــ ان پرچوں کے عوض ہم خریداروں کی مدت میں توسیع کر دیں گے۔ اعزازی اور تبادلہ کے طور پر جن حضرات کی خدمت میں الحق پہنچتا ہے۔ وہ حضرات اگر فائل نہ رکھتے ہوں تو مذکورہ پرچے ادارہ کو مفت پیش فرما کر شکریہ کا موقع بخشیں ـــــ ایجنٹ حضرات سے بھی گذارش ہے۔ کہ اپنے حلقہ سے مذکورہ رسائل حاصل کر کے مرحمت فرمائیں۔ ہم ان کے عوض الحق کے نئے پرچے مفت پیش کریں گے۔ مصارف ڈاک ادارہ ادا کرے گا۔

ـــــ (ادارۃ الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور)

قرآنی علوم و معارف

از حضرت علامہ شمس الحق افغانی مدظلہ

ضرورت وحی پر حضرت علامہ افغانی کے مقالہ کا یہ آخری حصہ ہے۔ اس کے بعد صداقت قرآن پر حضرت مولانا کے محققانہ افادات ادارہ کو ملے ہیں۔ جو انشاء اللہ شائع کئے جائیں گے۔

— ادارہ —

ضرورتِ وحی

دلیلِ اتباعی

انسان میں جذبۂ اتباع موجود ہے۔ مثلاً اولاد والدین کی پیروی کرتی ہے۔ شاگرد اساتذہ کی اور اصاغر اکابر کی اتباع کرتے ہیں۔ رعیت بادشاہ کی اور مرید پیر کی۔ تو اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انسانی فطرت میں جذبۂ اتباع موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ ہر چیز کی ایک علت ہوتی ہے۔ آخر اس اتباع کی علت اور سبب کیا بن سکتا ہے۔ تو تلاش اور جستجو کے بعد معلوم ہوا۔ کہ اتباع کے اسباب چار چیزیں ہیں۔ ۱۔ قدرت ۲۔ حسن ۳۔ کمال ۴۔ احسان۔

پہلی علت یعنی قدرت کے تحت محکوم حاکم کی اتباع کرتا ہے۔ اولاد احسان کی وجہ سے والدین کی اتباع کرتی ہے۔ اربابِ کمال کی اتباع ان کے کمالات کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ عاشق حسن کی وجہ سے معشوق کی اتباع کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ یہ چیزیں ذاتی ہیں۔ یا عارضی یعنی باہر کی۔ تو یہ بات مسلمات میں سے ہے۔ کہ انسان میں یہ اشیاء ذاتی نہیں۔ مثلاً بادشاہ میں بوجہ بادشاہی قدرت ہوتی ہے۔ لیکن جب بادشاہ پیدا ہوتا ہے۔ تو بادشاہی ساتھ نہیں لاتا۔ اور جب مرتا ہے تو بادشاہی یہیں کی یہیں دھری رہ جاتی ہے۔ اس طرح آفرینش سے انسان حسن والا نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ اوصاف ذاتی نہیں، عارضی ہیں۔ اور ہر عارضی وجود کے لئے اصلی وجود کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً دھوپ زمین کے لئے ایک عارضی چیز ہے۔ کیونکہ یہ دن کو تو ہوتی ہے۔ مگر رات کو نہیں ہوتی۔ دھوپ اپنے فوائد کی وجہ سے محبوب ضرور ہے۔ لیکن کرۂ ارضی کیلئے یہ ذاتی صفت نہیں۔ بلکہ اس کا خزانہ اور سرچشمہ آفتاب ہے۔ اس طرح ان چاروں اوصاف کا حال ہے۔ کہ سب کے لئے اصل کا وجود لازمی ہوگا۔ جیسے دھوپ کے لئے آفتاب کا وجود — تو

ان اوصافِ عارضہ کا اصل منبع ذاتِ رب العالمین ہے۔ وہی سرچشمہ ہے۔ اور انہی کے ساتھ عشق لگانا چاہئے۔ مولانا رومؒ کیا خوب فرما گئے ہے

عشق با مردہ نباشد پائیدار عشق را با حیّ و با قیوم دار

تو مخلوقات میں ان اوصاف کا وجود ظلّی ہے۔ اور ذاتِ رب العالمین میں اصلی ہے۔ جب ظلّی وجود اتباع کا خواہاں ہوتا ہے۔ تو اصلی وجود بطریق اولیٰ خواہاں ہوگا۔ جب ظلّی وجود میں کشش اتباع ہے۔ تو اصلی میں بھی ضرور ہوگی۔ اور اتباع اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ مرضیات اور غیر مرضیات کا علم نہ ہو۔ گویا کہ فلسفہ مجبور کرتا ہے۔ خدا کے اتباع پر اور خدا کی اتباع مجبور کرتی ہے مرضیات اور لامرضیات کے علم پر اور یہ علم بغیر وحی کے حاصل نہیں ہو سکتا تو معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح و نجات اور ہدایت دارین کے لئے وحی الٰہی کی ضرورت ہے۔

تلك عشرة كاملة ۔ ▲▲

بقیہ :- مجلس معارف القرآن

کی کتب کی فراہمی اور اسکو لائبریری میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ رکھنے کی تجویز پیش نظر ہے۔

مقصد اگرچہ بہت بلند اور مقصد کے تقاضے بہت وسیع الاطراف ہیں۔ لیکن یہ کام چونکہ ایک جماعتی شکل میں انجام پذیر ہو رہا ہے۔ اور اس کے لئے ظاہری اسباب و وسائل بھی جماعتی تعاون ہی کی شکل میں پیدا ہو رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ ہوتے رہیں گے۔ اور پھر اس مرکزِ دینی وعلمی سے شروع کیا جا رہا ہے جس نے برصغیر کی گذشتہ صد سالہ اسلامی تہذیب اور دینی زندگی کی تعمیر و اصلاح میں معمار اوّل کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ اور اس مقام کو ان بابرکت نفوسِ زکیہ سے نسبت ہے۔ جن کی قائم کردہ پُرخلوص بنیادوں پر اس ادارۂ ملّی "دارالعلوم دیوبند" کو موجودہ رفعت و شوکت اور عظمت و شہرت حاصل ہوئی ہے۔

اس لئے خداوند قدوس کی شانِ کریمی سے یہ یقین آفرین امید ہے کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے توسط سے مجلس معارف القرآن کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع بھی پیدا فرمائے گا۔ اور اسکی خدمات کو ملت کے مستقبل کیلئے بہر نوع مفید و مثمر اور نتیجہ خیز بھی بنائے گا۔ اور قرآن کریم کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے اور مؤثر طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی توفیق بخشے گا۔ "وباللہ التوفیق"

ڈاکٹر فضل الرحمان اور اُن کے تحقیقاتی فلسفہ کے بنیادی اصول

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مدرسہ احیاء العلوم ماموں کانجن ۔ ضلع لائل پور

—— گزشتہ سے پیوستہ ——

ان تمام مباحث کو سامنے رکھنے سے جو اہم سوال کھڑا ہونا چاہئے تھا وہ یہی ہے کہ اسلام کا یہ عظیم الشان اور عدیم النظیر علمی ذخیرہ جو ہمارے سامنے، تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، اصول وغیرہ کی شکل میں عبادات عقاید، معاملات، اخلاق، حدود اور سیاسیات وغیرہ کے مختلف شعبوں پر مشتمل موجود ہے۔ یہ آخر کیا چیز ہے؟ بس اسی سوال کے جواب کا نام "فلسفۂ ارتقاء اسلام" ہے۔ پہلے اجمالاً ذہن نشین کرایا گیا کہ یہ سب عہد وسطیٰ کے فقہاء (و محدثین) کی رنگ آمیزی ہے۔ (۴۶)

اس کے بعد حدیث، فقہ، عقاید، اصول، الغرض علوم اسلامیہ کے ایک ایک شعبہ کو لے کر اس کے ارتقائی منازل بیان کئے جانے لگے، اور اسلام کے اصول و فروع میں سے ایک ایک چیز کا سرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کاٹ کر زمانۂ مابعد سے جوڑا جانے لگا، اور ساتھ کے ساتھ ہر ہر مرحلہ پر امت مسلمہ کے قائدین اور دین اسلام کے محافظین، ائمہ مجتہدین، فقہاء و محدثین، بلکہ صحابہ و تابعین کی فرضی لغزشوں کے افسانے تراشے جانے لگے۔ اور یہ سب کچھ اتنی معصومیت، صفائی، سبک رفتاری، اور ملمع کاری سے کیا گیا کہ قاری خود بخود یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے، کہ دنیا کا سب سے بڑا مکروہ اور سازشی مذہب اسلام ہے۔ اور خطۂ زمین کی سب سے بدتر، مکار اور فریبی قوم ہر دور کے علماء کرام اور ناقلینِ اسلام ہیں۔ معاذ اللہ۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب "اسلامی منہاج کی تاریخ" (بزبان انگریزی جس کا اردو ترجمہ بسلسلۂ مقالات فکر و نظر کی زینت ہے۔) اسی موضوع پر کامیاب شاہکار ہے ——

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

(۴۶) فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۱۲

"فلسفۂ ارتقاء اسلام" کے یہ مبادی اور اصول مغربی مزاج اور ذہنیت کی پیداوار، اور ان کے مزعومہ مقاصد کی صاف صاف غمازی کرتے ہیں، ان میں یہودی مستشرقین عمومی طور پر اہل علم کا وہ بدقسمت اور بے توفیق گروہ ہے جس نے قرآن و حدیث، سیرت نبوی، فقہ اسلامی، اور اخلاق و تصوف میں بار بار غوطے لگائے، اور بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آیا، بلکہ اس سے اس کا عناد، اسلام سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ اور بڑھ گیا۔ (۲۷)

چنانچہ پہلے اصول کو لیجئے، کہا گیا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اساسی طور پر اخلاقی معلم تھے: یہ اہل مغرب کے نظریہ کی ترجمانی ہے، انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بڑے مفکر، اچھے سیاست دان، عظیم قومی راہنما، بلند درجہ ریفارمر، اور مصلح اعظم کی حیثیت سے تسلیم کر لینے میں کبھی کوئی عذر نہیں ہوا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی نوع انسان پر عظیم الشان احسانات کو بھی بڑی فراخدلی سے تسلیم کریں گے، اسلام کو ایک عظیم انقلابی تحریک کی حیثیت سے مان لینے سے بھی انہیں انکار نہ ہوگا۔ آپؐ نے قرآن مجید کے ذریعہ سے جو اصلاحِ عالم کا صور پھونکا، اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ نے جس فدائیت، جانبازی، اور جاں نثاری کا مظاہرہ کیا اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت، دور اندیشی اور سیاسی قائدانہ صلاحیتوں کا کرشمہ قرار دینے میں بھی انہیں باک نہ ہوگا۔ وہ یہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ مادرِ گیتی نے آپ جیسا عظیم قائد، عظیم مدبر، اور داعیٔ انقلاب پیدا نہیں کیا، وہ ڈاکٹر صاحب کے اس خراجِ تحسین کو بھی مان لیں گے کہ "آنحضرت کے کردار میں مذہبی اقتدار اور جمہوریت کا کچھ ایسا حسین انداز کا امتزاج تھا، جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔" (۲۸) (یہ ہے نبی کی نعت۔ ! معاذ اللہ)

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کی تمام جزئیات اور تفصیلات جن کا تعلق خالص اخلاق سے ہے، ان کے تسلیم کر لینے میں انہیں ذرا تامل نہ ہوگا، بلکہ آپ کے ذاتی اخلاق و عادات، صبر و استقامت، اور لیاقت و قابلیت کو بسر و چشم قبول کرنے میں بڑی عالی ظرفی کا ثبوت دیں گے۔
ان تمام چیزوں کے باوجود انہیں جس امر کے تسلیم کرنے سے عار، ضد اور انکار ہے۔ اور جسے تسلیم کئے بغیر آپ کے فضائل و کمالات اور اخلاق و عادات کی تمام گردان بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ صاحب شریعت نبی تھے، آپ جو کچھ فرماتے یا جو کچھ کرتے تھے، وہ محض اپنے دل و دماغ، عقل و فہم اور بصیرت و ادراک سے نہیں، بلکہ "مامور من اللہ" ہونے کی حیثیت سے کرتے تھے۔ وحی الٰہی آپؐ کے ہر قول و فعل، حرکت و سکون، نشست و برخاست، نیند اور بیداری، صلح و جنگ، اور عبادات و معاشرت کی ذمہ دار، محافظ، اور نگران رہتی تھی، اس لئے آپؐ کا ہر قول و فعل،

(۲۷) الفرقان لکھنؤ جلد ۳۱ ش ۷، ص ۳۲ (۲۸) فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۱۸

منشاء خداوندی میں تھا، دین و شریعت کا مستقل اصول، اور وحی خداوندی کا قانون ہوتا تھا، پھر آپ چونکہ صرف نبی مرسل نہ تھے۔ بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ تمام ادیانِ سابقہ کے لئے ناسخ بھی تھے، اس لئے آپ کی تشریف آوری سے دینِ موسوی، دینِ عیسوی، اور خطۂ عالم کے تمام ادیان پر خطِ تنسیخ کھنچ گیا۔ وصول الی اللہ کے دوسرے تمام راستے بند ہو گئے۔ معراجِ انسانیت کی تمام سعادتیں صرف آپ کے نقشِ قدم اور آپ کے اسوۂ حسنہ میں منحصر ہو گئیں، اس لئے آپ کی بعثت کے بعد صرف امتیں نہیں بلکہ امتوں کے نبی — اولوالعزم نبی صلوات اللہ علیہم۔ بھی آپ ہی کے فیصلہ، آپ ہی کے قانون، آپ ہی کی شریعت، آپ ہی کی تعلیم، آپ ہی کی کتاب، اور آپ ہی کی حکمت اور سنت پابند ہوں گے۔ پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ آپ خاتم النبیین، آخری نبی اور قیامت تک تمام انسانیت کے عالمگیر نبی ہیں۔ آپ کی امت آخری امت، آپ کی کتاب آخری کتاب اور آپ کی شریعت آخری شریعت ہے۔ اس لئے آپ کا دین ایسا جامع دین ہونا چاہئے۔ اور آپ کی شریعت ایسی جامع قانونِ شریعت ہونی چاہئے۔ کہ اس کے بعد کسی شریعت، کسی قانون، کسی دینی نظریہ، تھیوری اور اتھارٹی کی ضرورت باقی نہ رہ جائے۔ (۴۹)

الغرض دانشورانِ مغرب کو اپنی تمام علمی کاوشوں کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، رسالت، وحی، شریعت اور ماموریت من اللہ سے انکار ہے۔ ورنہ جیسا کہ ہم نے ابھی کہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں "اخلاقی مصلح" "عظیم مفکر، داعیٔ انقلاب، محسنِ انسانیت" وغیرہ خوبصورت القاب کے تسلیم کر لینے سے ان کا کیا بگڑتا ہے، ان کے مذاہب پر کیا زد آتی ہے۔ ان کے تحریف شدہ مجموعہ کتب پر کیا حرف آتا ہے۔ اور ان کی بے پناہ خواہشات کی آزاد روی کی کیا حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

یہ ہے فلسفہ ارتقاء کا بنیادی پتھر جسے ہمارے ڈاکٹر صاحب نے دانایانِ فرنگ سے حاصل کیا، اور بڑی سادہ مزاجی سے اس پر ارتقاء اسلام کی عمارت اٹھانا شروع کر دی، یعنی یہ کہ "آنحضرت اساسی طور سے بنی نوعِ انسان کے اخلاقی مصلح تھے۔" ہم ایک دفعہ پھر اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں "اساسی طور پر اخلاقی مصلح" کا نظریہ بظاہر اپنے اندر کتنی ہی طمع کاری اور دلفریبی کیوں نہ رکھتا ہو، لیکن اسکی تہ میں آپ کی نبوت و رسالت اور دین و شریعت کے انکار کا چور چھپا ہوا ہے۔ ہم صاف کہیں گے کہ جن اہلِ مغرب نے

(۴۹) ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ، باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان۔ ص ۱۱۸۔ طبع منیریہ

یہ نظریہ پیش کیا یہ ان کی کور چشمی، ہٹ دھرمی، اور بد باطنی کی دلیل ہے، اور ان کے جن مشرقی شاگردوں نے اسے قبول کیا۔ یہ ان کی سادہ لوحی، خود فریبی اور ایمان سے محرومی کا نشان ہے۔
ہمارے ان فریب خوردہ دوستوں کو اگر ان الفاظ میں درشتی اور گرانی کا احساس ہو، تو میں ان سے بصد احترام معذرت کرتے ہوئے یہ سوال کرنے کا حق مانگتا ہوں کہ " قرآن مجید کی کس آیت میں یہ "اساسی" نظریہ بیان کیا گیا، کتاب اللہ کے کس فقرے میں آپ کو "یہا المصلح اساساً" کے لفظ سے خطاب کیا گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کس حدیث اور ارشاد میں اس اساسی حیثیت کو ذکر کیا گیا، اور اسلامی تاریخ کی چودہ صدیوں میں کس صحابی، تابعی، فقہ اور امام نے یہ کہا آپؐ کی اساسی حیثیت " اخلاقی مصلح " کی تھی اور بس ——
کسی کو غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے۔ ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحِ اخلاقی سے انکار نہیں، بلکہ ڈاکٹر صاحب کے " اساسی نظریہ " کے منفی نقطۂ نظر سے انکار ہے۔ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور دین و شریعت پر ایمان لاتے ہیں۔ اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اساسی حیثیت " احکام الٰہی کے بندوں تک پہنچانے والے رسول " کی ہے۔ "اخلاقی مصلحیت" کا تصور عقیدہ نبوت کا جزو لاینفک ہے۔ اس لئے اخلاقی مصلحیت دائرہ نبوت میں آپ سے آپ آجاتی ہے۔ ہر نبی اخلاقی مصلح بھی ہوتا ہے، لیکن ہر اخلاقی مصلح نبی نہیں ہوتا۔ بحث یہ ہے کہ ان مغربی کافروں کے سوا کسی اور کو بھی کبھی ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معنوی، غلط اور دھورا تصور سوجھا کہ آپؐ اساسی طور پر اخلاقی مصلح تھے ——؟ اور یہ کہ آپؐ کی اس حیثیت سے کس کافر کو انکار ہے؟ اور یہ کہ اسلام میں آپؐ کی اساسی حیثیت کیا صرف اتنی سی ہے۔ جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کی؟ اور یہ کہ کیا ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب آپؐ کی یہ اساسی حیثیت کا نظریہ تسلیم کر لینے اور اسے بڑی آب و تاب کے ساتھ پیش کرنے سے کفر کی دلدل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔؟
ڈاکٹر صاحب جس فلسفہ کے زور سے بقول خود دینِ اسلام کی پوری عمارت ہی کو منہدم کر دینے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ (۵۰) آپ دیکھ رہے ہیں کہ خود اسی کی بنیاد جہنم میں گرتے ہوئے کنارے پر کھڑی ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں " خاتم النبیّن " کے عقیدہ کی جگہ " اساسی طور پر اخلاقی مصلح " کا نظریہ، جسے انہوں نے اپنے یہودی اساتذہ سے حاصل کیا، اور اسے ابلہ فریبی سے اپنے فلسفۂ ارتقاء کا سنگ بنیاد بنا ڈالا۔ اب ڈاکٹر صاحب کے سامنے دو ہی راستے ہیں، اگر وہ اپنے اس نظریہ پر جو انکار نبوت کے ہم معنیٰ ہے۔ قائم رہتے ہیں، تو مسلمانوں کو بجا طور پر یہ کہنے کا حق

(۵۰) فکر و نظر جلد ۱ ش ۷،۸ ص ۱۰ سطر ۱-۲

حاصل ہے، کہ ڈاکٹر صاحب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت اور اسلام کی صداقت پر ایمان نصیب نہیں، ان کا جگہ جگہ آپ کو نبی یا آنحضرت (بغیر درود وسلام) لکھنا اہلِ مغرب کی نقالی ہے۔ اور اگر وہ اپنے اس "اساسی" نظریہ سے دستبردار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام لوازمِ نبوت سمیت نبی ماننے کیلئے تیار ہوں۔ تو ان کے فلسفۂ ارتقار کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔ اس لئے انہیں یا اپنے ایمان اور اسلام کو بچانا ہوگا، یا مغرب کے چبائے ہوئے فلسفۂ ارتقار کو ـــ دونوں کے یکجا کرنے سے انہیں معذوری ظاہر کرنی ہوگی۔ خوب کہا اقبالؒ مرحوم نے ؎ بڑے ہی تیز ہیں یورپ کے رندے میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ

اب ذرا دوسرے "ارتقائی اصول" پر غور کیجئے، کہا گیا کہ "آپ شارع نہ تھے، آپ نے اسلام کی ترقی کے لئے کوئی قانون سازی نہیں کی۔ نہ از روئے قیاس اس کے لئے آپ کو فرصت تھی" (۵۱) یہ نظریہ بھی خالص یہودی پروپیگنڈا کی پیداوار ہے۔ جسے ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب نے پیش کیا، اور اسے وحی آسمانی کی طرح قطعی سمجھ کر فلسفۂ ارتقار کی بنیاد میں چن دیا۔ جس سے وہ بزعم خود دین اسلام کی پوری عمارت کی بنیاد اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ اس نظریہ سے نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بلکہ پوری تاریخِ نبوت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے۔ ان میں سے ہر ایک نبی کسی نہ کسی "آسمانی شریعت" خواہ وہ جدید ہو یا قدیم، پر قائم تھا۔؟ شریعت کے بغیر نبوت کا تصور احمقانہ نظریہ ہے۔ تاریخ نبوت میں ایک نبی کا نام بتلایا جائے، جو کسی شریعت کا پابند، کسی آسمانی قانون کا تابع اور کسی قسم کے اصولِ تشریع پر قائم نہ تھا، مگر یہ مسئلہ یہودی پروفیسر اسمتھ سے نہیں بلکہ قرآن سے سمجھ میں آئے گا۔ اور ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب کی مشکل یہ ہے کہ وہ یہودی عینک کے بغیر قرآن پڑھنے سے معذور ہیں۔ قرآن اعلان کرتا ہے۔

۱۔ لکل امۃ جعلنا منکم شرعۃً ومنھاجاً (مائدہ آیت ۴۸)	ہم نے ہر امت کے لئے ایک شریعت اور ایک منہاج مقرر کیا۔
۲۔ لکل امۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ (الحج۔ آیت ۶۷)	ہم نے ہر امت کے لئے ایک راہ شریعت مقرر کی جس پر وہ چلا کئے۔
۳۔ شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہٖ نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا بہٖ	اللہ نے تمہارے لئے بھی اسی دین کی شریعت مقرر کی جسکی وصیت نوحؑ کو تھی اور جسکی وحی

(۵۱) فکر ونظر جلد ۱ شمارہ ۱ ص ۱۸

ابراھیم و موسیٰ و عیسیٰ الآیۃ (الشوریٰ آیت ۱۳) — آپ کی طرف فرمائی، اور جسکی وصیت ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی۔

۴۔ ثم جعلناک علی شریعۃ من الامر فاتبعھا ولاتتبع اھوآء الذین لایعلمون۔ (الجاثیہ۔ آیت ۱۸) — پھر ہم نے آپ کو ایک شریعت دین پر قائم کیا، پس آپ اسی کی پیروی کرتے رہیں۔ اور نادان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنے پائیں۔

لیکن ان قرآنی اعلانات کے علی الرغم ڈاکٹر صاحب اعلان کرتے ہیں۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاحب شریعت نہ تھے۔ حیرت ہے۔ کہ آج ڈاکٹر صاحب ایسے ذی علم شخص کے طفیل اس "بدیہی" مسئلہ پر قلم اٹھانا پڑا۔ جس کے انکار کی توقع کسی نادان، جاہل، مجنون اور دیوانے سے بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب بھولتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ نبی کو قانون سازی کی ضرورت نہیں ہوتی، نبی کو بنا بنایا قانونِ شریعت، وحی آسمانی سے دیا جاتا ہے۔ اور نبی اس پر اس مضبوطی اور سختی سے قائم ہوتا ہے۔ کہ نبی کا ہر قول و فعل شرعِ الٰہی کی تفسیر اور قانونِ خداوندی کا ترجمان بن جاتا ہے۔ ۲۳ سالہ دورِ نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ظاہر ہے کہ، ساکت و ساکن چپ چاپ بیٹھے نہیں رہے۔ بلکہ ہر آن اور ہر ساعت جو اقوال و افعال آپ سے سرزد ہوئے، وہی قانونِ شریعت ہوتا تھا، پھر اسکی تدوین کے لئے کاغذی فائلوں اور قرطاسی پرندوں کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ ہزاروں صحابۂ کرامؓ کی شکل میں زندہ ریکارڈ مشینیں شریعتِ محمدیہ کا ریکارڈ لینے اور اسے مدون کرنے میں مصروفِ عمل تھیں، دارارقم سے لیکر صحنِ کعبہ، صفۂ مسجدِ نبوی، مسجدِ قبا، وادیٔ بدر، وادیٔ حنین اور میدانِ تبوک تک اس قانونِ شریعت کی کلیات الشرعیہ۔ لایونیورسٹیاں تھیں، جہاں اس قانون کے اصول و فروع اور اسرار و علل کے رموز سمجھانے جاتے ہیں۔ وحی الٰہی ان ہونہار طالب علموں کو صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃً کی ڈگریاں دے رہی تھی۔ اور عنایتِ الٰہیہ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کیلئے ان کو آلہ اور جارحہ بنا رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ کہ نبی کو فرصت نہ تھی، بے ادبی معاف ہو تو میں کہوں گا کہ یہودی تعلیم و تربیت نے ان کو نبوت کے صحیح تصور سے اندھیرے میں رکھا ہے۔ اسی لئے وہ نبی کے لئے قانون سازی کی فرصت کا سوال اٹھاتے ہیں۔ کیا وہ مجھے یہ سوال کرنے کا حق دیں گے۔؟ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ زندگی کا کون سا لمحہ تشریع، بیانِ شریعت، سے خالی جاتا ہے۔ آپؐ کا کھانا پینا سونا جاگنا، چلنا پھرنا، گھر میں گھر کے لوگوں سے اور گھر سے باہر احباب و اصحاب سے ملنا برتنا، کیا

یہ سب چیزیں مسلمانوں کے لئے شریعت نہ تھیں؟ کسی کو اس عموم میں مبالغہ کا وہم نہ ہو، بلاشبہ نبی کا سونا بھی تشریع سے خالی نہیں ہوتا، نہ وحی کا تعلق نیند کی حالت میں اس سے منقطع ہوتا ہے۔ نبی کی ہر خلوت وجلوت، قول وفعل، صحت ومرض، بیداری اور نیند، حتیٰ کہ زندگی اور موت امت کے لئے قانونِ شریعت ہوتی ہے۔ حق جل مجدہٗ فرماتے ہیں:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب) — تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی خاص قول وفعل، اعتقاد وعمل اور عبادت ومعاشرت کو نہیں بلکہ خود ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے لئے بہترین نمونہ بنایا گیا ہے۔ جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے جو کچھ بھی صادر ہوگا۔ وہ امت کے لئے شریعت، قانون اور دستور العمل بنتا چلا جائے گا۔ آپ چاہیں تو اسے یوں تعبیر کر لیں کہ نہ نبی شریعت سے کبھی ایک انچ ہٹنے پاتا ہے۔ اور نہ شریعت نبیؐ سے ایک لمحہ کے لئے بھی الگ ہو سکتی ہے۔ نبی جدھر نکل جاتا ہے، وہی راہ شریعت بن جاتی ہے۔ اور نبی جہاں بیٹھ جاتا ہے، وہی نشست قانونِ شریعت بن جاتا ہے۔ کیوں نہ ہو جب نبیؐ سے اعلان کرایا جاتا ہے کہ:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ — آپ فرما دیجئے بلاشبہ میری نماز، میری عبادت یا قربانی، میری زندگی اور میری موت یہ سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔

جب نبی کی زندگی اور موت کا ہر نقشہ رضائے الٰہی میں فنا ہو کر صرف اللہ کے لئے ہو کر رہ جاتا ہے۔ تو کون کہہ سکتا ہے۔ کہ نبوی زندگی کا کوئی لمحہ تشریع (بیانِ شریعت) سے خالی جاتا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پر تعجب ہے کہ نبی کو تشریع کی کب فرصت تھی، اور ہمیں تعجب اس سے ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریع سے "کب فرصت تھی۔ (دیکھئے "کی" اور "سے" کا فرق کہاں سے کہاں جا پہنچا۔)

ڈاکٹر صاحب نے انکارِ شریعت پر دلیل بھی کیا خوبصورت اور زبردست بیان فرمائی، یعنی "قیاس یہ کہتا ہے کہ نبی کو فرصت نہ تھی" مجھے ان کے خفا ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو بصد ادب عرض کرتا، کہ آنجناب نے تمام شریعتِ اسلامیہ اور پورے دینِ خداوندی کو رد کرنے کے لئے "قیاس یہ کہتا ہے" کی جو منطق ایجاد کی ہے۔ اسکی نسبت "قیاس یہ کہتا ہے" کی ابلیسی منطق صرف ایک حکم الٰہی

کو ٹالنے کے لئے جو اس نے ایجاد کی تھی، کئی درجہ وزنی ہے۔ اس لئے کہ اس لعین نے اپنے "قیاس یہ کہتا ہے" کو ثابت کرنے کے لئے منطقی انداز کے کچھ غلط سلط فرضی مقدمات ترتیب دے کر ایک وجہ تو گھڑ ہی لی، مگر آپ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا۔ آپ نے صرف "قیاس یہ کہتا ہے" پر گذر بسر کی کم از کم اس کے دو ایک جھوٹے سچے مقدمات ہی ترتیب دے لئے ہوتے۔

پھر ڈاکٹر صاحب کے قیاس نے جو کچھ کہا ہے یعنی نبی کو تشریح کی فرصت نہ تھی: اسے ایک لمحہ کے لئے بفرضِ محال تسلیم کر لیجئے، تو کیا فوراً سوال نہ ہوگا۔ ؛ کہ کیا وحی نازل کرنے والا خدا بھی عدیم الفرصت تھا۔ آخر اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لاقانونیت کی زندگی کیوں گذارنے دی، اور اگر قانونِ شریعت کی تدوین کیلئے "ادارۂ تحقیقات اسلامیہ" ہی کی ضرورت تھی تو فرشتوں کا ایک بورڈ مقرر کیا جا سکتا تھا۔ آخر جو کام آج ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی سی اداری کر ڈالنا چاہتی ہے، ڈاکٹر صاحب کا قیاس کیوں کہتا ہے کہ وہی کام نہ خدا کر سکتا تھا نہ اس کے فرشتے، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ ہو سکتا تھا نہ صحابۂ کرام سے، لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بریں عقل و دانش بباید گریست

کچھ بھی ہو ڈاکٹر صاحب کا قیاس مانئے یا نہ مانئے، کہے یا نہ کہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام انسانی حاجات کیلئے کافی وافی اور جامع قانونِ شریعت کتاب وحکمت کی شکل میں نازل فرمایا، صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تلاوت اور قولی وفعلی تعلیم فرمائی۔ مجتہدین صحابہ وتابعین اور ائمۂ دین نے اسکی تشریح وتفسیر کو اس قدر نکھار دیا، کہ الحاد و زندقہ اور تحریف وتغییر کے سب دروازے بند ہو گئے۔ اب جو شخص اس تشریح وتفسیر پر حملہ کرے گا اسے شریعت کا انکار کئے بغیر چارہ نہ ہوگا، ہمارے ڈاکٹر صاحب کا دامنِ ایمان اسی انکاری خارزار میں الجھ کر تار تار ہے۔ نعوذ باللہ من فتنۃ الصدر۔

ڈاکٹر صاحب سالہا سال کی مغربی تعلیم اور استشراقی تربیت کے باعث "انکارِ شریعتِ محمدیہ اور ہدم اسلام" کے جس مقام میں راسخ القدم ہیں، اس کے پیشِ نظر ان سے اور ان کے مکتبِ فکر سے یہ توقع بظاہر مشکل ہے۔ کہ وہ ہم غریب بوریا نشین قدامت پسندوں کی معروضات پر توجہ، اپنے مغربی نظریات پر تنقید، اور بے چارے اسلام پر رحم فرمانے کیلئے تیار ہوں گے، بلکہ یہاں تو مضمون یہ ہے کہ "میں کہوں گا حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟" لیکن پھر بھی دل چاہتا ہے۔ کہ کم از کم "معذرۃ الی ربکم" کی حد تک اس سلسلہ میں مزید گذارش کر دی جائے، ولعلہم یتقون۔ (اور اس لئے بھی کہ شاید وہ ڈر جائیں۔) ـــــ انکارِ شریعت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا سب سے بڑا وسوسہ

کہیے یا شبہ یہی ہے۔ کہ نبیؐ کو تشریع ۔ یا ان کے لفظوں میں قانون سازی کی فرصت کہاں تھی ۔؟ حالانکہ اتنی بات ڈاکٹر صاحب بھی جانتے ہوں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۲۳ سالہ زندگی میں فرد اور معاشرے سے متعلقہ تمام امور سے سابقہ پیش آیا ۔ انفرادی زندگی سے لیکر حکومت کے انتظام و انصرام اور بین المملکتی تعلقات تک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسائل زندگی ایک ایک کرکے آئے ، اور یہ بھی ظاہر ہے ۔ کہ آپ نے معاذ اللہ ان پیش آمدہ مسائل کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال دیئے ۔ بلکہ وحی الٰہی ، فراست نبوت اور بصیرت حکیمہ ۔ یا ڈاکٹر صاحب کی اصطلاح میں طبیمانہ بصیرت کے ساتھ آپ نے زندگی کی تمام مشکلات کا حل پیش کیا ، پیش آمدہ مسائل کی ایک ایک گرہ کو کھولا ، اور زندگی کے ہر موڑ کے لئے آپ نے راہنمائی فرمائی اور ان کے لئے راستہ متعین کیا ۔ ان تمام امور کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح یا باصطلاح جدید قانون سازی نہ کہا جائے گا ۔؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے یہ تشریع کتنی آسان ہے ۔ جس کے لئے طویل فرصت اور تحقیقاتی بورڈ کی سفارش کی قطعاً حاجت نہیں ۔ کہ نبی ایک دفعہ وضو کرکے دکھلاتا ہے ۔ تو کتاب الوضوء کے سینکڑوں جزئیات کی تعلیم و تشریح ہو جاتی ہے ۔ نبیؐ وحی الٰہی کی روشنی میں امت کے سامنے نماز کی دو یا چار رکعتیں پڑھ لیتا ہے ۔ تو کتاب الصلوٰۃ کے ہزاروں مسائل کی تشریح کا دفتر کھل جاتا ہے ۔ اسی طرح زکوٰۃ ، روزہ ، حج ، قربانی ، جہاد ، نکاح و طلاق ، بیع و شراء حدود و قصاص ، معاملات و معاشرت کے لاکھوں مسائل کی تشریح نبیؐ اپنی فعلی تعلیم سے چند لمحوں میں کر دیتا ہے ۔ اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے ۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ زندگی بھی تشریح کے لئے ناکافی ثابت ہوتی ۔؟

اور یہ تو آپؐ کی فعلی تشریح کا حال ذکر کیا گیا ۔ اسی کے ساتھ اگر آپؐ کے ارشادات ، کلمات ، طیبات اور جوامع الکلم کو بھی ملا لیا جائے ، تو تشریح نبویؐ کا مسئلہ اور بھی قریب الی الفہم ہو جاتا ہے ۔ یہاں صرف ایک مثال عرض کرتا ہوں ۔ نبیؐ ایک معصوم بچے سے از راہ ملاطفت و مزاح کہتا ہے ۔ یا اباعمیر ما فعل النغیر ۔ (ابوعمیر ! وہ بلبل کیا ہوئی ۔؟) یہ بادی النظر میں ایک معمولی مزاحی فقرہ ہے ، جس کے حروف کی تعداد بھی ۱۲ سے زائد نہیں ۔ گن دیکھئے ۔ لیکن یہی چند حرفی فقرہ جب لسان نبوت سے صادر ہوتا ہے ۔ تو مزاج شناسان نبوت کو اسی سے بیسیوں ۔ بلکہ تقریباً یکصد مسائل شرعیہ کا سراغ مل جاتا ہے ۔ ملاحظہ ہو شروح حدیث ۔ جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان برحق یہ ہو اوتیت جوامع الکلم وعلوم الاولین والآخرین ۔ (مجھے جامع کلمات اور اولین و آخرین کے علوم عطا کئے گئے ۔) اسی نبیؐ کے بارے میں ، میں نہیں سمجھتا ، کہ کس مومن کے مونہہ سے یہ بات بھی نکل سکتی ہے ۔ کہ آپؐ کو

معاذ اللہ تشریح کی فرصت نہیں ملی۔

تقریب الی الفہم کے لئے وحی اور نبیؐ کے باہمی تعلق کو روح وجسم" یا قوت برقیہ اور مشینی آلات کے مابین تعلق سے سمجھا جاسکتا ہے، جس طرح تمام اعضائے جسم کی ساخت ٹھیک اور درست کر دینے کے بعد قدرت الٰہیہ اس پر روح کا فیضان کرتی ہے۔ اور مرکز جسم یعنی قلب سے روح کا تعلق جوڑ دیا جاتا ہے۔ تو تمام اعضائے جسم اپنا اپنا کام شروع کر دیتے ہیں، کان سننے لگتے ہیں، زبان گویائی میں مصروف ہو جاتی ہے۔ آنکھیں محو تماشا ہو جاتی ہیں۔ پاؤں تگ و دو میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ قبض و لبسط، داد و ستد اور گرفت و گذار میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ الغرض جسم کے تمام آلات وجوارح اور قوائے شعور و احساس کے یہ تمام افعال بظاہر جسم ہی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت شناس جانتا ہے۔ کہ یہ تمام افعال روح کا فیض ہے۔ اور اعضائے جسم اس کیلئے آلہ کار ہیں۔ یا مشین کے پرزوں کو پوری طرح فٹ کر دینے کے بعد برقی خزانہ سے جب بجلی چھوڑی جاتی ہے اور ان مشینی آلات کا برقی طاقت کے ساتھ جب رابطہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ تو پوری مشین اور اس کا ایک ایک پرزہ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے۔ یہاں بھی ان مشینی پرزوں کی حرکت اور تگ و دو ان کی ذاتی نہیں بلکہ یہ تو قوت برقیہ کیلئے آلہ کار ہیں۔ ٹھیک اسی طرح، لیکن بلاتشبیہ، نبیؐ کے قوائے علمیہ وعملیہ کی تکمیل کے بعد جب نبیؐ کے قلب اطہر کا ملاء اعلیٰ سے رابطہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ اور وحی الٰہی کی برقی روح کا اس پر فیضان ہوتا ہے۔ تو وحی الٰہی کی تشریح وتفسیر اور اس کے منشا کی تفصیل وتوضیح کے لئے نبیؐ کی شخصیت سراپا عمل بن جاتی ہے۔ پھر اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے۔ وہ ایک ظاہر بین کی نظر میں نبیؐ کا عمل ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت شناس" جانتا ہے۔ کہ یہ سب وحی الٰہی کی کارفرمائی ہے۔ اور نبیؐ اس کے لئے جارحہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔

پھر جسطرح یہ ناممکن عادی ہے۔ کہ جسم کے تمام اعضاء بالکل صحیح سالم ہوں اور روح کا تعلق بھی جسم سے قائم ہو، اس کے باوجود جسم، روح کے اشارۂ چشم وابرو کی تعمیل نہ کرے۔ یا مشین کے پرزے بالکل ٹھیک حالت میں اپنی اپنی جگہ فٹ ہوں۔ اور بجلی کا کنکشن بھی ان سے ٹھیک قائم ہو۔ لیکن اس کے باوجود یہ مشینی آلات حرکت میں نہ آئیں۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ــــــ جو قبل از نبوت ہی جسم وروح، اخلاق وعادات، اعضاء وجوارح اور حسب ونسب کے ہر نقص سے پاک کر لیا جاتا ہے ــــــ کے ساتھ سلسلۂ وحی قائم ہو جانے کے بعد ایک لمحہ کیلئے بھی وہ منشائے وحی کی تعمیل میں کوتاہی کرے۔ ماضل صاحبکم وما غویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ اس لئے کہ اس

رابطہ کے بعد نبیؐ کا ہر قول و فعل اور علم و عمل وحیِ الٰہی کی ذمہ داری سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔

پھر جسطرح لوہا اور پیتل وغیرہ کے پگھلے ہوئے سیال مادہ کو مختلف قالبوں میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ اور یہ ایک وحدت ان قالبوں میں جاکر نوع در نوع شکلوں میں متشکل اور مختلف ڈیزائن کے گوناگوں پرزوں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح، بلاکیف و تشبیہ، وحیِ الٰہی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی قوالب میں ڈھلتی ہے، تو اعتقادات، عبادات، اخلاق، معاملات، سیاسیات اور معاشیات کے تشریعی قوانین کی شکل میں متشکل ہوکر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور حکمت کا نام پاتی ہے۔

ویعلمہم الکتاب والحکمۃ۔ ای السنن کما فسر بہ بعض السلف۔

الغرض نہ وحیِ خداوندی نبیؐ کے عمل کے بغیر اپنی تفصیلی تشریحات میں ظہور پذیر ہوتی ہے، نہ نبیؐ کے عمل کو وحی سے جدا کیا جاسکتا ہے۔ وحی کا صحیح مفہوم اور اسکی ٹھیک ٹھیک تعمیل اسی وقت ممکن ہوگی جبکہ اسے اعمالِ نبویہ کے جزئیاتی قوالب میں رکھ کر پڑھا جائے گا۔ اور اس پر عمل کیا جائے گا۔ کون نہیں جانتا کہ وحیِ الٰہی نماز کا حکم دیتی ہے۔ لیکن یہ نماز نبی کے عمل میں متشکل ہوکر سامنے آئے گی۔ صلوا کما رأیتمونی اصلی، وحیِ خداوندی زکوٰۃ کا حکم دیتی ہے۔ یہ حکم اپنی تفصیلی نوعیت کے ساتھ سننِ نبویہ کے آئینہ میں جلوہ گر ہوگا، وقس علیٰ ہذا۔ یہی راز ہے کہ حق تعالےٰ نے کسی نبی کے بغیر کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی، بلکہ کتاب کے ساتھ صاحبِ کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی بھیجا گیا، تاکہ وہ احکامِ کتاب کی تفصیل و تعین اور اس کے اسرار و رموز اور تشریحی قوانین کی توضیح کرے۔ واللہ اعلم،

(تنبیہ) اس بحث میں وحی اور صاحبِ وحی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تعلق کے لئے جو مثالیں ہم نے دی ہیں۔ ان سے محض تقریبِ فہم مقصود ہے، ورنہ ظاہر ہے۔ کہ وحی کی اصل کیفیت ہر قسم کی مثال سے بالاتر اور ہر تشبیہ سے وراء الوریٰ ہے۔

اب ہم ڈاکٹر صاحب کے فلسفۂ ارتقاء کے تیسرے فرضی اصول پر بحث کریں گے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ۱۔ صحابہ کرام پیدا ہونے والے نزاعات کا فیصلہ اپنی فہم و خرد یا رسوم و رواج کے مطابق خود ہی کرلیا کرتے تھے۔ ۲۔ صرف انتہائی غیر معمولی حالات ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فیصلہ کی زحمت دی جاتی تھی۔ ۳۔ اور بہت ہی خاص حالات قرآن کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ ۴۔ لیکن ان قرآنی اور نبوی فیصلوں کی نوعیت بھی محض ہنگامی اور وقتی واقعات کی ہوتی تھی۔ ۵۔ اس لئے ان کو متشددانہ طور پر قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ ۶۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ "ایک گونہ نظیر ہی" کہا جا

سکتا ہے ۔ (۵۲)

یہ چند کے چھ فقرے بھی خالص یہودی ذہن کی پیداوار ہیں ۔ اور ان میں کفر و نفاق عریاں ناچتا ہے ۔ پہلے فقرے میں بتلانا مقصود ہے ۔ کہ معاذ اللہ ، دورِ نبوی میں لاقانونیت کا دور دورہ تھا ، وہ لوگ کسی اصول ، کسی ضابطہ ، قاعدہ اور قانون کے پابند نہ تھے ، اسلام سے پہلے وہ اپنی عقل و فہم اور رسوم و رواج کی جس ڈگر پر چلا کرتے تھے ، اسلام کے بعد بھی وہ بدستور اسی پر چلتے رہے ، اسلام نے انہیں کوئی قانونِ عبادت ، قانونِ معاشرت ، قانونِ معاملات ، قانونِ سیاست ، قانونِ تعزیر اور قانونِ اخلاق نہیں بخشا تھا ، بلکہ ان کے لئے قانونِ عمل ، یا خود ان کی اپنی عقل و فہم تھی ۔ یا وہ رسم و رواج جن کو "معمولی تبدیلی" کے بعد علیٰ حالہٖ رہنے دیا گیا تھا ، کیا اس فقرے کے مضمرات یہی نہیں ہیں ۔؟ اس مفروضہ سے ایک طرف دورِ نبوی کی تمام تاریخ مسخ ہو کر رہ جاتی ہے ۔ اور دوسری طرف اسلام کی عدمِ افادیت بلکہ لغویت پر مہر لگ جاتی ہے ۔ خالکم بدہن ۔

دوسرے اور تیسرے فقرے میں صحابہ کرام کی ذہنیت ، مزاج اور جذبات کی پوری تاریخ کو اس قدر سیاہ دکھایا گیا ہے ۔ جس سے زائد کا تصور بھی ہمارے لئے ممکن نہیں ، یعنی خدا و رسول کی طرف رجوع کرنے یا موصوف کے لفظوں میں سہارا لینے کی ضرورت تو صحابہ کرامؓ صرف انتہائی غیر معمولی حالات یا بہت ہی خاص حالات میں محسوس کیا کرتے تھے ، ورنہ غیر معمولی حالات ، اور بہت خاص حالات میں بھی وہ خدا و رسول سے بے نیاز ہی رہا کرتے تھے ۔ امت کے تمام اکابر محدثین پر "تاریخ ساز" کا فتویٰ (۵۳) صادر کرنے والے مجتہد کا اپنا ضمیر اگر اس غلط ، بھونڈی اور مکروہ تاریخ سازی پر ملامت نہیں کرتا ، تو تمام دنیا اندھوں کی نگری نہیں ، تاریخِ صحابہ کا مبتدی طالب علم بھی اس پر "صد نفرین" کہے گا ۔ حالاتِ صحابہ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ سورج کے منہ پر تھوکنے کے مترادف ہے ۔

چوتھے فقرے میں قرآنی اور نبوی فیصلوں کو محض ہنگامی اور وقتی قرار دے کر بعد میں آنے والی امت کا رشتہ ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کاٹنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قیامت تک رہنے والی نبوتِ عامہ ، پر کاری ضرب لگانے کی مکروہ کوشش کی گئی ہے ۔ جو خالص یہودیانہ تحریف ، اور ابدیتِ دینِ اسلام کے خلاف ، سوچا سمجھا منصوبہ ، اور کھلی سازش ہے ، میں پوچھنا چاہتا ہوں ، کہ اس خالص افتراء اور "سفید جھوٹ" کی کیا دلیل ہے ۔ کہ قرآن و حدیث اور خدا و رسول

(۵۲) فکر و نظر جلد ا شمارہ ا ص ۱۸ (۵۳) جلد ا شمارہ ، ص ۱۰

کے تمام فیصلے محض وقتی تھے، بعد کی امت کو ان کی پابندی سے چھٹی مل گئی، جب قرآن کو تاقیامت باقی رہنا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کی تمام انسانیت کے لئے نبی ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کے بعد آنے والے بھی آپ کے اسی طرح امتی ہیں جس طرح آپؐ کے زمانہ کے لوگ تھے، جب اسلام ابدی صداقت ہے۔ جسے ہمیشہ رہنا ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب کے کان میں یہ وسوسہ کس شیطان نے پھونک دیا ہے۔ کہ مسلمان قرآن کو کتاب اللہ سمجھ کر ضرور پڑھا کریں، لیکن ان کے فیصلوں کو ہنگامی اور وقتی کہہ کر ان سے جان چرایا کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مانا کریں، لیکن آپ کے فیصلوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کریں، کہ یہ اسی وقت کیلئے تھے۔ اسلام کو دین حق تسلیم کیا کریں۔ لیکن اس اعتقاد کے ساتھ کہ اس کے تمام قوانین ہماری مرضی کے تابع ہیں، اپنے کو نبی کے امتی کہا کریں، لیکن ساتھ یہ نظریہ بھی رکھیں کہ ہم نبی کے کسی فیصلہ کے پابند نہیں ہوں گے۔ ع تو ہی بتا کہ پھر کافری کیا ہے۔؟ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

پانچویں فقرے میں ان مذکورہ بالا مفروضات کے نتیجہ کے طور پر صاف صاف کافرانہ اعلان کر دیا گیا ہے جس کے سننے کی تاب بھی، میرا خیال ہے، کسی مسلمان کو نہیں ہو سکتی، یعنی خدا کا فیصلہ بندوں کے لئے اور نبی کا فیصلہ امت کے لئے لائق عمل قانون کا درجہ نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر صاحب جس حکومت کے نمک خوار ہیں، ذرا اس کے بارے میں اعلان کر دیکھیں، کہ اس کا دستور یہاں کے لوگوں کے لئے دستور کا اور اس کا کوئی قانون ہمارے لئے قانون کا درجہ نہیں رکھتا، جسے متشددانہ طور سے حرف بحرف نافذ کیا جائے۔ فوراً آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ لیکن یہ تمام مسخرہ پن خدا و رسول کے احکام اور فیصلوں ہی کے ساتھ سوجھتا ہے۔ لیکن اس قسم کے مسخروں کے بارے میں خدا تعالیٰ کا اعلان بھی سن رکھئے:

قل ابا اللہ وآیاتہ ورسولہ کنتم تستھزءون	اے نبی! آپ اعلان فرمادیں کہ کیا تم اللہ سے
لا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم	اور اسکی آیات سے دل لگی کرتے ہو؟ بہانے

نہ بناؤ! تم دعوائے ایمان کے باوجود کافر ہو گئے ہو ـــــ!

چھٹا فقرہ اس سے بڑھ کر بیہودیانہ اور اشد کفراً و نفاقاً کا مصداق ہے۔ ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب خدا و رسول کے فیصلہ کو قانون کیا نظیر کامل ماننے کیلئے بھی تیار نہیں، کیونکہ ان کی "اسلامی تحقیقات" کو اس سے بھی خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ ہے۔ بلکہ وہ اسے صرف "ایک گونہ نظیر" قرار دیتے ہیں،

گویا ماتحت عدالتوں کیلئے عدالتِ عالیہ کا فیصلہ جس احترام کا مستحق ہے۔ بلکہ ایک متوازی اور ہم مرتبہ عدالت کیلئے دوسری عدالت کا فیصلہ جس قدر لائقِ احترام ہے، ڈاکٹر صاحب کے "ماڈرن اسلام" میں خدا و رسول کے فیصلوں کو اتنا شرفِ احترام بھی حاصل نہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے اشہبِ قلم کی سبک خرامی ملاحظہ کیجئے، کہ وہ ایک ہی سانس میں ان ملحدانہ اور زندیقانہ دعووں کی بھرمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے لئے حرام ہے کہ کسی ایک دعویٰ کی بھی عقلی یا نقلی توجیہ کریں، ان کے ان تمام دعاوی کی سند ان کے استاذ محترم یہودی پروفیسر جناب اسمتھ کے ارشادات ہیں جو ان کے حافظہ میں محفوظ ہیں اور بس۔

میں ڈاکٹر صاحب سے باادب التماس کروں گا، کہ آپ براہِ کرم مسلمانوں کو قدامت پسندی میں مبتلا، اور قبرستانوں کی طرف رخ کرنے والے رہنے دیں[1] مسلمان اس نام نہاد جدید اسلام کو لیکر کیا چاٹیں گے۔ جس میں خدا و رسول کو بھی فیصلے سے معزول کر دیا گیا ہو، آپ کے یہ نظریات مسٹر پرویز کے نظریہ "مرکزِ ملت" کی بگڑی ہوئی شکل ہے، آخر اس ریچ پیچ اور لگ لپیٹ کی کیا ضرورت ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیا جاتا، کہ ہم خدا کو خدا، رسول کو رسول، اور اسلام کو دین کی حیثیت سے ماننے کیلئے تیار نہیں، اس کے بعد جس قسم کی تحقیقات کا شوق فرمائیں مسلمانوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آخر خدا و رسول، قرآن و حدیث، اور دین و شریعت کے خلاف زہر اگلنے اور مکروہ پروپیگنڈا کرنے سے آپ کو کیا حاصل ہوگا، مسلمان ہزار گنہگار سہی مگر اتنی ایمانی رمق ان میں بہرحال باقی ہے۔ کہ جس ذات پر وہ ایمان لاتے ہیں، اسی کے خلاف آپ کے ان زہر آلود تیروں کی بارش کو ٹھنڈے دل سے برداشت نہیں کرتے رہیں گے۔ ایاز! قدرِ خویش بشناس! آپکو شاید اندازہ نہیں کہ مسلمان قوم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت کے معاملہ میں کتنی غیور اور نازک احساس واقع ہوئی ہے۔ جرأت بے جا کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ کتنی ڈھٹائی اور فراخ ذہنی کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ خدا و رسول کے فیصلے قانون نہیں بلکہ صرف ایک گونہ نظیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ کس کے لئے۔ مسلمانوں کے لئے! خدا کے بندوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کہلانے والوں کے لئے۔؟ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

اب اس فلسفۂ ارتقاء کے چوتھے اور آخری اصول کو سامنے لائیے۔ اب تک جتنے اصول ذکر کئے گئے ان میں خدا و رسول کے فیصلے کا ذکر، دقتی اور ہنگامی منطق کے پیوند کے ساتھ ہی سہی

---

[1] ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے۔ کہ ماضی کی طرح قرآن و حدیث کیطرف سادہ رجعت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم قبرستانوں کی طرف رخ کرلیں۔ ملاحظہ ہو فکر و نظر جلد ۲ ش ۵-۶ ص ۳۰۱

بہر حال آتا رہا ہے۔ مگر اس فلسفہ کی اختراع کرنے والے اعداء اللہ، اعداء الاسلام اور اعداء المسلمین کی اصل غرض، اصل مقصد اور اصل خواہش یہ تھی کہ کسی طرح دینِ اسلام کا رشتہ وحی خداوندی سے کاٹ کر انسانی افکار کی اختراع سے مربوط کر دیا جائے۔ یہ مقصد اس چوتھے اصول میں صاف صاف اگل دیا گیا۔ چنانچہ کہا گیا کہ:

محض مذہب یا حکومت سے تعلق رکھنے والی بڑی بڑی پالیسیوں کے طے کرنے یا اہم اخلاقی اصولوں کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنے ہی میں آنحضرت نے کوئی اقدام فرمایا، لیکن اس کے لئے بھی آپ اکابر صحابہ سے مشورہ کر لیا کرتے تھے، یعنی ان کا مشورہ تنہائی یا پبلک میں حاصل کر لیا جاتا۔ (۵۴)

اس اردو عبارت کا مفہوم واضح ہے، یعنی ۱۔ چند پالیسیوں یا اہم اخلاقی اصولوں کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی فیصلہ نہیں فرمایا۔ ۲۔ وہ فیصلہ بھی محض وقتی ہوتا تھا، دوسرے وقت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ۳۔ پھر جو فیصلہ بھی آپ نے فرمایا وہ وحی خداوندی یا آپ کی تنہا رائے کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ اکابر صحابہ کے نجی یا علانیہ مشورہ کا رہینِ منت ہوتا تھا، اور اس عبارت کے مفروضات سے حسب ذیل سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ اسلام خدا کا نازل کردہ آسمانی دین نہیں، بلکہ معاذ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ محمد کے ملی بھگت اور گٹھ جوڑ کا نتیجہ، ان کے شورائی فیصلوں کا مجموعہ، اور انسانی ذہن و فکر کے مخترع اصولوں کا نام ہے۔ ۲۔ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ حیات میں بھی کبھی جامع نظامِ زندگی جو فرد اور معاشرے کے تمام شعبہائے زندگی میں دخیل ہو، کے خواب سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، بلکہ اس وقت بھی اسکی کل کائنات، کل اثاثہ اور تمام سرمایہ چند مبہم قسم کے اخلاقی اصول یا پالیسیوں کے فیصلے تھے۔ ورنہ ان کے علاوہ آپ نے مسلمانوں کو کوئی اعتقادی، عباداتی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور نظریاتی نظام نہیں دیا۔ نہ آپ نے کسی قسم کا کوئی فیصلہ فرمایا۔ ۳۔ پھر چونکہ ڈاکٹر صاحب کے بقول آپ کے یہ چند اخلاقی اور پالیسی فیصلے بھی محض وقتی اور ہنگامی تھے۔ اس لئے رحلتِ نبوی اور مرورِ وقت کے ساتھ ہی اسلام کا یہ قلیل اثاثہ بھی لٹ گیا، اس لئے مسلمانوں کو اسلام پر تو انا للہ پڑھنی چاہیے، اور اپنے مسائل خود حل کرنے کے لئے نظام ہائے زندگی خود مرتب کرنے چاہئیں، ورنہ اسلام ان کی مشکلات کو حل نہیں کر سکتا۔

اگر میں نے ڈاکٹر صاحب کی اس اردو عبارت کا مفہوم سمجھنے یا اس کے مضمرات کو بصورتِ نتائج ظاہر کرنے میں ٹھوکر کھائی ہو، تو میں طالب علم کی حیثیت سے اس کے صحیح مفہوم اور صحیح نتائج

---

(۵۴) فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۸،

کا جو خیر مقدم کروں گا، اور اگر الفاظ کی سختی نرمی سے قطع نظر میں نے اس اردو عبارت کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ تو اس عبارت اور اس کے پیدا کردہ نتائج پر تبصرہ کا حق بسر دست محفوظ رکھتے ہوئے، ان تمام دانشمندانِ ملت سے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے فیصلوں کو وقتی کہہ کر رد کر دینے، اسلام کو محمد اور اصحاب محمد کے شورائی گٹھ جوڑ کا نتیجہ قرار دے لینے اور اسلام کا کل اثاثہ چند وقتی اور ہنگامی قسم کی پالیسیوں اور اخلاقی اصولوں کو جن کی تفصیل جناب ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب بہادر بھی بتلانے سے معذور ہیں۔ مان لینے کا فیصلہ نہیں کر لیا، میں ان حضرات سے اپیل کروں گا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے افکار و آراء اور عزائم و مقاصد کی تہ کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ۔

اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں

پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ میں ڈاکٹر فضل الرحمان کی تقریر کا جائزہ

از قلم مولانا محمد یوسف صاحب

(ماموں کانجن)

بقیہ : دیارِ عرب ———— چنانچہ حضرت فاطمہؓ، حضرت نسیبہؓ اور چند دوسری صحابیات کا میدانِ جہاد میں موجود ہونا صحیح روایت سے ثابت ہے ——— زعبی صاحب کا اندازِ بیان کچھ ایسا تھا کہ ان کے نزدیک عورت اگر اپنی مرضی سے میدانِ جہاد میں مردوں کے دوش بدوش لڑنا لڑنا چاہے تو شریعت میں اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک میرے علم کی رسائی ہے۔ بعض صحابیات کا غزوات میں جانا زخمیوں کی مرہم پٹی اور ان کو پانی پلانے اور اس قسم کی دوسری خدمات کے لئے ہوا کرتا تھا عملی طور پر عورت کا جنگ میں حصہ لینا ثابت نہیں ہے۔

اختتام محاضرہ پر زعبی صاحب نے خصوصی مجلس میں ہمیں خوش آمدید کہی۔ پاکستان اور اہالی پاکستان کے بارے میں اچھے تاثرات کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ شعبی کی روایت سے ایک حدیث میری نظر سے گذری ہے جس کی سند کی مجھے تحقیق نہیں ہے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ عرب دین سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ اور ان کو صحیح راہ پر لانے کیلئے عجم ان کے ساتھ لڑنے آئیں گے۔ انہوں نے تواضع کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے خیال میں وہ زمانہ قریب آرہا ہے۔ کہ ہمیں درست کرنے کیلئے عجم ہمارے ساتھ برسرِ پیکار ہوں۔ اور کوئی بعید نہیں ہے کہ یہ پاکستان کے عجم ہوں ——

باقی آئندہ

چند ہفتے دیارِ عرب میں

مولانا سید عبداللہ کاکاخیل
فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ

مدینہ سے عمان تک

بلادِ عربیہ کی سیر و سیاحت، عربی زبان اور عربی ثقافت سے واقفیت حاصل کرنے کا ولولہ بچپن سے قلب میں جوش زن تھا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جامعہ اسلامیہ کی طالب علمی کی صورت میں مسلسل چار سال تک مدینہ منورہ میں قیام کا شرف عطا فرما کر میری یہ دیرینہ تمنا پوری کر دی ——— حجازِ مقدس کے بعد شام و فلسطین کی مبارک سرزمین دیکھنے کے لئے موقع کی تلاش تھی۔ چنانچہ جامعہ اسلامیہ سے فارغ التحصیل ہو کر وطن آنے سے قبل میں اپنے ہمدرس رفیقِ محترم مولانا عبدالرزاق و مولانا حسن جان صاحب کی معیت میں ایک ماہ کے لئے اردن، شام، اور لبنان کے تفریحی دورہ پر گیا۔ اس سفر کے احوال و تاثرات تقریباً ہر روز ڈائری میں قلمبند کرتا رہا۔ برادر عزیز مولانا سمیع الحق صاحب کی خواہش پر یہ یادیں قارئینِ الحق کے ہدیہ نظر ہیں۔ ——— عبداللہ کاکاخیل ———

منگل ۵ر جولائی ۱۹۶۶ء سعودی عرب کے مقامی وقت کے مطابق صبح سوا چار بجے ہمارا جہاز "مدینہ ایر پورٹ" سے عمان کے لئے اڑا۔ یہ دو انجنوں والا چھوٹا جہاز تھا۔ سوار ہوتے وقت جہاز کا ہوا باز ہم نے دیکھا۔ اسکی شکل و صورت سے بعض ساتھیوں کو گمان ہوا، کہ یہ انگریز ہے۔ مجھے بھی اس گمان کی تصدیق کرنے میں کوئی خاص تردد نہیں ہوا۔ کیونکہ عام طور پر سننے میں آتا ہے۔ کہ سعودی طیاروں کے ہوا باز زیادہ تر امریکن یا یورپین ہوتے ہیں۔ تاہم اس تفکر میں میں محو ضرور ہوا کہ اس مقدس سرزمین مہبطِ وحی پہ ایک غیر مسلم کو قدم رکھنے کا موقع کیونکہ دیا جا رہا ہے۔ جبکہ یہاں کے شرعی قانون میں غیر مسلموں کے لئے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی حدود میں داخل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس کی وجہ ملکی ہوا بازوں کا کم ہونا ہو تو اسلامی ممالک سے ہوا باز طلب

کرنے سے بھی تو یہ کمی پوری کی جا سکتی ہے۔

میں اس تصور میں محو تھا کہ اتنے میں جہاز کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ "چند لمحوں بعد ہمارا جہاز "مدینہ ایرپورٹ" کو چھوڑنے والا ہے۔ یہ جہاز سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑان کر کے دو گھنٹے چالیس منٹ کے عرصے میں عمان پہنچے گا۔ جہاز کے ہوا باز کا نام محمد اکرم ہے"

ہوا باز کا اسلامی نام سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ دینی جذبات کا تقاضہ یہی تھا کہ حرمین کی یہ مقدس اور پاک سرزمین ایسے ناپاک قدموں سے ملوث نہ ہو۔ رہا اس مسئلہ میں فقہا کا اختلاف اور دلیل کے اعتبار سے کسی پہلو کا راجح اور مرجوح ہونا تو اس سے اس وقت ہمارا کوئی سروکار نہیں تھا۔

جہاز چونکہ کم بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ اس لئے نیچے کا منظر کافی حد تک صاف نظر آ رہا تھا۔ مدینہ سے عمان تک کا پورا راستہ سنگلاخ وادیوں اور خشک پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ ابھی دو گھنٹے نہیں گذرنے پائے تھے کہ ہمارا جہاز "تبوک" کی بستی کے اوپر پرواز کرنے لگا۔ جہاز کے ایک ملازم نے ہمیں بتلایا کہ یہ "تبوک" ہے۔ اس وقت اس تصور میں ڈوب جانا ایک طبعی امر تھا کہ یہ طویل مسافت جو ہم نے چشم زدن میں طے کر لی صحابہ کرام کے زمانے میں کتنا شاق اور جاں گداز سفر تھا۔ حجاز کی تڑپا دینے والی گرمی، مسافت کی اس دوری اور پھر سنگلاخ وادیوں اور خشک ریگستانوں کے خطرناک سفر نے "غزوہ تبوک" کو کتنا مشکل بنایا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے۔ کہ بہت سے منافقوں کا نفاق اس میں ظاہر ہوا۔ اور کئی مسلمان اسکی وجہ سے ابتلاء میں پڑ گئے۔ لیکن یہ صحابہ ہی کا مقام تھا کہ دینِ حنیف کی خاطر وہ اتنی عظیم قربانیاں پیش کر گئے۔ ان کا عشرِ عشیر بھی اگر آج کے مسلمان پیش کر دیں تو ان کی حالت کچھ سے کچھ ہو جائے

جہاز اعلان کے مطابق بالکل ٹھیک وقت پر "عمان" کے ایرپورٹ پر اترا۔ جہاز سے اترنے کیلئے سیڑھی پر پہلا ہی قدم رکھ کر اس شہر کی تہذیب و تمدن کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہم لگا سکے۔ ایرپورٹ پر بہت سے لوگ اپنے خویش و اقارب کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ لباس سب کا انگریزی تھا۔ مرد کوٹ پتلون اور عورتیں بدترین قسم کا عریاں لباس پہنے ہوئے کھڑی تھیں۔

ایسے ماحول میں ہم اپنے لباس اور وضع قطع کے اعتبار سے اوپرے معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن ہماری اسی وضع قطع نے ایرپورٹ پر ہمیں فائدہ ضرور پہنچایا۔ کسٹم والوں نے ہمارے

سامان کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ حالانکہ یہاں تفتیش میں سختی ہونے کی وجہ سے مسافروں کا بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ یہ محض ہمارے پاکستانی ہونے کا اعزاز تھا۔ اور ہمارا لباس پاکستانی ہونے کا ایک ظاہری ثبوت تھا۔

ایرپورٹ سے ایک شاندار ٹیکسی پر سوار ہو کر ہم شہر گئے۔ یہاں کے ڈرائیور نو وارد وں کو لوٹنے میں بڑے مشہور ہیں۔ نصف دینار سے کم کرایہ لینے پر ڈرائیور رضامند نہ ہوا۔ حالانکہ اصل کرایہ ربع دینار سے زیادہ نہ تھا۔ ڈرائیور کا یہ سلوک مجھے زیادہ نامانوس بھی معلوم نہ ہوا۔ کیونکہ خود ہمارے ملک میں بھی بہت سے دوکاندار، ڈرائیور اور نیچے طبقے کے دوسرے لوگ نو وار دوں کی ناواقفیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کرتے۔

"خندق النصر الجدید" میں ہم نے قیام کیا۔ یہ ایک متوسط درجے کا ہوٹل ہے۔ اور عمان کی مشہور جامع مسجد "المسجد الحسینی" کے قریب واقع ہے۔ تین چارپائیوں کا کمرہ ہم نے تیس قرش کی چارپائی کے حساب سے نوے قرش میں لے لیا۔ (اردنی دینار میں سو قرش ہوتے ہیں اور دینار ایک سٹرلنگ پونڈ کے برابر ہوتا ہے۔)

یہاں کے معمولی اور متوسط ہوٹلوں میں اپنے ریسٹورنٹ کا انتظام نہیں ہوتا ہے۔ البتہ ہوٹل کے منتظمین وقت پر طعام مہیا کرنے پر مکلّف ضرور ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہماری اس قسم کی خدمت عماد نامی ایک فلسطینی لڑکے کے سپرد رہی جو کہ سکول کی چھٹی جماعت کا طالب علم ہے۔ اور گرمی کی تعطیلات میں ہوٹل کی ملازمت کرتا ہے۔

عماد کی طرح غاصب یہودیوں کے مظالم کے شکار بے شمار سکول کے دوسرے فلسطینی لڑکے بھی فارغ اوقات میں اسی قسم کی معمولی ملازمت کرتے ہیں۔ ان میں بہت سے بچوں کے والدین کسی وقت اپنے ملک میں عزت اور آرام و راحت کی زندگی بسر کر چکے ہوں گے۔ لیکن آج ان کا آرام و راحت مفقود ہے۔ اور وہ پیٹ پالنے کیلئے اپنے بچوں سے اسی قسم کے معمولی کام کرانے پر مجبور ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں دھکیلے ہوئے ان ستم زدہ مہاجرین کی زبانِ حال مسلمانانِ عالم سے اپیل کرتی ہے۔ کہ وہ رنگ و نسل اور ملک و وطن کے فوارق سے بالاتر ہو کر اسرائیل کے وجود کو۔ جو عالمِ اسلامی کے قلب میں ناسور کی حیثیت رکھتا ہے، صفحۂ ہستی سے مٹانے کیلئے متحد ہو جائیں۔

عصر کی نماز "مسجد الحسینی" میں پڑھ کر ہم "دار الاخوان المسلمین" میں گئے۔ چند اخوانی حضرات نے جو مکتبہ میں مطالعہ کر رہے تھے ہمارا اچھا استقبال کیا، اور طویل خوش آمدید کے بعد پاکستان

کے حالات دریافت کئے۔ ان کے سوالات زیادہ تر پاکستان میں دینی سرگرمیوں کے بارے میں تھے۔ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی سے وہ متعارف تھے۔ دونوں جماعتوں کے افکار و نظریات، طریقۂ کار اور اس کے عملی نتائج سے بھی وہ کافی حد تک واقف تھے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں دوسرے دینی اداروں اور جماعتوں کے بارے میں انہوں نے دریافت کیا۔ میں نے خاص طور پر اپنے ملک کے اسلامی مدارس کے نظام سے ان کو متعارف کیا۔ کہ اس وقت ملک کے دونوں حصوں میں ہزار سے زیادہ اسلامی مدارس کام کر رہے ہیں۔ یہ مدارس اہل خیر کے تبرعات پر چلتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے کسی قسم کی مالی امداد قبول کرنا ان کے مزاج اور اصول کے خلاف ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ مدارس تعلیم و تربیت کے نظام میں بالکل آزاد ہیں۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طلباء ان سے فارغ ہو کر درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور دوسرے دینی مناصب سنبھالتے ہیں۔ اور اس طریقہ سے ان مدارس کے ذریعہ ملک میں دین کی ایک عظیم خدمت انجام پائی جارہی ہے۔

اخوانی حضرات سے جب ہم نے دریافت کیا کہ کیا ان کو "اردن" میں مکمل طور پر آزادی حاصل ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ظاہری عنوان تو آزادی کا ہے۔ لیکن حکومت جماعت کی ہر حرکت و سکون پر کڑی نگرانی رکھتی ہے۔ حکومت کو اخوان سے کسی قسم کی ہمدردی ہرگز نہیں ہے۔ البتہ "اخوان" سے حکومت کو یہ فائدہ ضرور ہے۔ کہ اشتراکیت اور شیوعیت کا مقابلہ کرنے میں اخوانی تحریک سے اسکو مدد مل رہی ہے۔ اور اسی مصلحت کی خاطر اخوان کو تھوڑی بہت آزادی حاصل ہے۔

"اخوان" نے شربت وغیرہ پیش کر کے ہماری خاطر تواضع کی۔ اس کے بعد "رابطۃ العلوم الاسلامیہ" کے دفتر میں جانے کیلئے ہم نے اجازت طلب کر لی چنانچہ ان میں سے ایک صاحب رہنمائی کے لیے ہمارے ساتھ ہو گئے۔

رابطہ کے صدر "تیسیر ظبیان" صاحب کے نام ہمارے جامعہ کے ایک مخلص دوست عبدالعزیز اسعد نے خط دیا تھا۔ یہ خط ہم نے تیسیر ظبیان صاحب کو دے دیا۔ بظاہر اس میں ہمارا تعارف تھا۔ ظبیان صاحب بڑی خوش لقائی سے پیش آئے عربی قہوہ سے ہماری ضیافت کی۔ مغرب تک ہم ان کے ساتھ مصروفِ گفتگو رہے۔ تیسیر ظبیان صاحب نے رابطہ کے مقاصد سے ہمیں متعارف کرتے ہوئے کہا۔ کہ "رابطۃ العلوم الاسلامیہ" ۱۹۵۱ء میں وجود میں آیا اسکی تاسیس کا مقصد عربی زبان کی نشر و اشاعت، دینِ حنیف کی دعوت کو عام کرنا،

عصرِ حاضرہ کے الحاد کا مقابلہ اور نئی روشنی کے نوجوانوں کے اخلاقی معیاروں کو بلند کرنا ہے۔ علاوہ ازیں اجتماعی، اقتصادی، طبی اور کئی دوسرے شعبوں میں مسلمانوں کی خدمت کرنا بھی رابطہ کے مقاصد میں داخل ہے۔ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے رابطہ نے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً مختلف علمی موضوعات پر محاضرات کا بندوبست بھی شامل ہے۔ چنانچہ آج بھی مغرب کی نماز کے بعد رابطہ کے دفتر میں اسی سلسلے کا ایک محاضرہ "حقوق المراۃ فی الاسلام" کے موضوع پر ہوگا۔ محاضر کا نام شیخ محمد علی زعبی ہے جو کہ لبنان کے مشہور محقق عالم ہیں۔

تیسیر ظبیان صاحب کے تقاضہ پر ہم نے محاضرہ سننے کے لئے مغرب کی نماز کے بعد دوبارہ رابطہ کے دفتر میں آنے کا وعدہ کر لیا۔ محاضرہ اپنے وقت پر شروع ہوا۔ اور کوئی دو گھنٹے تک جاری رہا۔ محاضرے کی اکثر باتیں میرے نزدیک تو عام اور مبتذل قسم کی تھیں۔ لیکن حاضرین جو جدید تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ تقریباً ہر بات پر داد و تحسین کی آوازیں بلند کرتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً جوش میں آکر تالیاں بھی بجا دیتے تھے۔ ویسے زعبی صاحب کی طرزِ ادا اور طریقۂ تفہیم نہایت مؤثر اور جذاب تھا۔

بطور مثال زعبی صاحب نے شرعی قانون میراث میں عورت کا حصہ مرد کے حصے کے نصف ہونے کی حکمت بیان کرتے ہوئے کہا۔ کہ شریعت نے مرد کو اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا ذمہ دار بنایا ہے۔ اور عورت پر اس قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

عورت جب تک باپ کے گھر ہوتی ہے۔ تو وہ اس کے اخراجات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور جب شوہر کے گھر چلی جاتی ہے۔ تو وہ اس کا اور اسکی اولاد کا نفقہ مہیا کرنے پر مکلف ہوتا ہے۔ اس لئے عدل و انصاف کا تقاضہ یہی تھا۔ کہ مرد کا حصہ ترکہ میں عورت کے حصے سے زیادہ ہو۔

اتنے سے نکتے کو حاضرین نے بہت سراہا۔ اور داد و تحسین کی آوازیں بلند کر دیں۔ زعبی صاحب نے محاضرہ جاری رکھتے ہوئے ایک قاعدہ بیان کیا۔ کہ اسلام نے بہت سے امور میں عورت کی ترکیب جسمی کا بھی خیال رکھا ہے۔ چنانچہ عورت کو بعض ان تکالیف پر مکلف نہیں بنایا گیا جو اسکی ترکیب جسمی کے منافی ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے جہاد کا ذکر کیا کہ عورت کی ترکیب جسمی کے پیش نظر عدل و انصاف کا تقاضی تھا۔ کہ اس پر جہاد فرض نہ کیا جائے۔ اور شریعت نے ایسا ہی کیا۔ لیکن اگر عورت اپنی مرضی سے جہاد میں شرکت کرنا چاہے۔ تو شریعت اسکو روکتی بھی نہیں۔

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

مولانا حفظ الرحمن اسیوہاروی ؒ

سوشلزم اور اسلام کا اقتصادی نظام

اسلامی معاشیات

سرمایہ دارانہ نظام کے اس ظالمانہ دستبرد نے آخر مزدوروں اور غریبوں میں بھی شعور، احساس اور بیداری کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اور انہوں نے ردعمل کے طور پر حقوق کے نام سے شور و غوغا مچایا۔ مجالس اور یونینیں قائم کیں۔ اور بغاوتیں کیں اور اٹھارویں صدی کے آخر ہی سے سوشلزم کے نظریہ نے ان کی حمایت شروع کر دی اور روس جیسے بڑے ملک میں اس بیسویں صدی میں انقلاب برپا ہونے کے بعد کارل مارکس کے نظریۂ "سوشلزم" کے ماتحت جدید اقتصادی نظام بھی قائم ہو گیا جس کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ وہ مفادِ عامہ کا داعی اور مزدوروں، کسانوں اور پست و مظلوم طبقوں کا حامی ہے ــــ اس لئے ضروری ہے۔ کہ اسلام کے اقتصادی نظام کا اس سے بھی موازنہ کیا جائے۔ اور محض کے اتباع اور حسنِ ظن کی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ دونوں نظامہائے اقتصادی کے اصولوں اور عملی تجربوں کے زیرِ اثر عدل و انصاف کے ساتھ محاکمانہ اور تبصرہ کیا جائے۔

ابھی کہا جا چکا ہے۔ کہ سوشلزم کی تاریخ کا آغاز بھی اٹھارویں صدی کے اواخر سے ہی ہو جاتا ہے۔ "ہیگل" نے اس کو اول ایک "علمی نظریہ" کی شکل میں پیش کیا اور اقتصادی امور میں بنیاد قرار دیا۔ اور اس کے اس نظریہ کو اقتصادی زندگی بخشنے بلکہ معاشرتی اصول بنانے اور تمدنی پروگرام میں ڈھالنے والا شخص کارل مارکس ہے [۱]۔ اور یہی نظریہ آجکل کیمونزم کی شکل میں روس پر حاوی ہے۔ اور دنیا میں انقلاب برپا کرنے میں مشغول و مصروف نظر آتا ہے۔

گذشتہ صفحات میں جو اشارات اس سلسلہ میں سپردِ قلم کئے گئے ہیں ان سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ اسلام جس مکمل قانون کا نام ہے۔ اس کے ساتھ اشتراکیت (کیمونزم) کا بھی بالطبع اتحاد ناممکن ہے۔ اس لئے کہ کارل مارکس اور دوسرے اشتراکی رہنماؤں نے جس فلسفہ پر

---

[۱] اور فریڈرک اینگلز کی علمی و عملی جد و جہد کا بھی اس تحریک میں بہت زیادہ دخل ہے۔

(مارکسزم) کی بنیاد قائم کی ہے۔ اس میں خدا سے انکار اور الٰہیات کی نفی صف اول میں جگہ پاتے ہیں۔ اور اس لئے اس کا علم الاخلاق بھی اسی روشنی میں مہذب و مرتب کیا گیا ہے۔

لہٰذا اس کے فلسفۂ لادینیت کے ساتھ اسلام کا کوئی رابطہ اور تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب ہم اس فلسفہ کے فقط اقتصادی پہلو سے بحث کرتے ہیں۔ اور دنیا کے دوسرے غیر اسلامی نظامہائے معاشی کے مقابلہ میں اس کو پیش نظر لاتے ہیں۔ تو اس وقت ہم کو اس حقیقت ثابتہ کے اظہار میں کوئی باک نہ ہونا چاہیے۔ کہ اس میں شک نہیں کہ اقتصادی نظام کے بہت سے امور میں اسلام اور اشتراکیت باہم متقارب نظر آتے ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف دونوں ہم آہنگ ہیں۔ اگرچہ طریق کار کے اختلاف سے دونوں کی راہیں اس وادی میں قطعاً جدا جدا ہیں۔

اسلامی نظام اقتصادی اور اشتراکی نظام اقتصادی کے درمیان جن امور میں اتفاق ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔۔۔ اکتناز و احتکار یا جمع دولت کا مذموم طریق کار اور مخصوص طبقہ میں دولت کی تحدید نہ یہ جائز قرار دیتا ہے اور نہ وہ، دونوں ان ہر دو امور کو باطل اور اقتصادی زندگی کے لئے تباہ کن سمجھتے ہیں۔

۲۔۔۔ دونوں ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ اقتصادی نظام کی اساس و بنیاد عام معاشی مفاد پر قائم ہو اور ہر شخص کو معاش سے حصہ ملے اور کوئی شخص بھی اس سے محروم نہ رہے۔

۳۔۔۔ دونوں کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ اقتصادی نظام کے دائرہ میں تمام انسانی دنیا جغرافیائی، طبقاتی اور نسلی و خاندانی امتیازات سے یکسر جدا ہو کر یکساں اور برابر حیثیت میں شمار ہو۔

۴۔۔۔ ان دونوں کے درمیان اس میں بھی اتفاق ہے کہ جماعتی حقوق، انفرادی حقوق پر مقدم ہوں۔

۵۔۔۔ ان دونوں کے درمیان یہ بھی مسلم ہے۔ کہ معاشی دستبرد کے ذریعہ حاکم و محکوم اور غلام و آقا کا سسٹم قائم نہ ہو سکے اور قائم شدہ کو مٹا دیا جائے۔

یہ وہ امور ہیں جن میں دونوں اقتصادی نظام ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ لیکن دو امر ایسے ہیں۔ کہ جن میں ان دونوں کے درمیان بنیادی اور اساسی اختلاف ہے۔ اور ان ہر دو امور میں ایک دوسرے کے ساتھ کسی طرح مطابقت پیدا نہیں کی جا سکتی اور یہ اختلاف اس وقت اور زیادہ وضاحت کے ساتھ رونما ہو جاتا ہے۔ جبکہ سوشلزم کا آخری درجہ "کمیونزم" کی شکل میں سامنے آتا

ہے۔ اور جس کا تجربہ آج کل روس میں کیا جا رہا ہے۔

اشتراکی اقتصادی نظام	اسلامی اقتصادی نظام
۱۔ دولت و ذرائع دولت سے انفرادی ملکیت کو مٹا دیا جائے۔	۱۔ دولت و ذرائع دولت میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسکی حدود قائم کر دی جائیں۔
۲۔ بلحاظ معیشت اختلاف درجات کا انکار کیا جائے اور معاشی لحاظ سے بھی سوسائٹی میں مساوات تسلیم کی جائے۔	۲۔ حق معیشت کی مساوات کے اعتراف کے ساتھ بلحاظ معیشت، اختلاف مدارج تسلیم کرتے ہوئے اکتناز کو روکا جائے۔

پہلا اختلافی مسئلہ اس طرح قابل غور ہے۔ کہ اگر آمدنی اور ذرائع آمدنی پر انفرادی ملکیت کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو عقل اور تجربہ اس طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ کہ ایسا ہو جانے کے بعد ذرائع پیداوار اور آمدنی میں بہت بڑا اختلال اور اضمحلال پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ انفرادی ملکیت کے نظام کو یکسر تباہ و برباد کرنے اور اس تمام سلسلہ کو اسٹیٹ کے حوالہ کر دینے کے بعد انسانوں کے قواعمل میں وہ زبردست تحریک پیدا نہیں ہو سکتی جو انفرادی ملکیت کی مسابقت کی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا۔ کہ جبکہ میری تمام جدوجہد اور حاجات وضروریات کا عملی نظام اسٹیٹ کے ذمہ اور صرف اس کے ہاتھ میں ہے تو میں کس لئے اپنے قوا دماغی، قوا جسمانی اور قوا عملی کو زیادہ محنت میں لگاؤں اور تنازع للبقا کے اس میدان میں کس لئے گرم مسابقت حاصل کرنے کی سعی کروں۔

لیکن اس کے برعکس انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے باہمی مسابقت اور دوڑ میں جو خرابی پیدا ہونے اور اجتماعی نقصانات کے بروئے کار آنے کے اندیشے پائے جاتے ہیں۔ اگر ان کا انسداد ضروری قرار دے کر قوا عملی و دماغی کو بھی اپنی فطری نشوونما کے مطابق کام کرنے کے لئے موقع بہم پہنچایا جائے۔ تو یہ طریق کار ہی صحیح طریق کار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ روس کے دس سالہ پروگرام کی ترمیم نے بھی اسکی تصدیق اسطرح کر دی ہے۔ کہ بہت سی زمینیں معطل رہ جانے اور ذرائع پیداوار میں رفتار کے سست پڑ جانے کی وجہ سے اب دس سالہ پروگرام میں ایک حد تک زمینوں میں انفرادی قبضہ کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اور بعض بعض مقامات پر ذرائع پیداوار میں انفرادی ملکیت داخل ہونے لگی ہے۔ اور تجربے سے حقائق تک پہنچنے کی اگر یہی طلب صادق رہی تو وہ وقت دور نہیں ہے کہ اسلام کے نظریہ اور اصول ہی کو اصول کار بنانا پڑے ___

اس لئے قرآن عزیز نے باوجود اس بات کے تسلیم کر لینے کے کہ اصل ملکیت صرف خدا کی ہے۔ اور اسی لئے تمہاری انفرادی ملکیت میں خدا کی عام مخلوق کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اور اس میں اجتماعی حقوق مقدم ہیں۔" ذاتی ملکیت کا اعتراف واقرار کرتے ہوئے انسان کے فطری قوائے عملی و دماغی میں مسابقت کا جذبہ پیدا کیا اور ان کو کشمکش حیات میں داخل کر کے ان پر حصولِ مال کی راہیں کھول دیں۔ نیز عقل و تجربہ کی بناء پر یہی راہ صحیح اور درست ہے کہ انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا جائے اور پھر اس پر اجتماعی بوجھ ڈالا جائے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ — تم ہرگز بھلائی کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنے پسندیدہ اور محبوب مال میں سے خرچ نہ کرو۔

اور قانونی وغیر قانونی ضابطوں کے ذریعہ انفرادی ملکیّت کا رخ بھی جماعتی فلاح اور بہبودی عامہ کی طرف پھیر دیا جائے۔

اس موقعہ پر اس اندیشہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کہ اگر پیداوار اور ذرائع پیداوار میں انفرادی ملکیت کے لئے ادنیٰ سی بھی گنجائش نکل آئے گی تو پھر مذموم سرمایہ دارانہ نظام کو اس سوراخ سے سر اٹھانے کا موقعہ ہاتھ آ جائے گا۔ لیکن یہ اندیشہ اس لئے صحیح نہیں ہے۔ کہ یہ ایسی حالت میں ضرور ممکن ہے۔ کہ انفرادی ملکیت تو کسی حد تک تسلیم ہو۔ لیکن اس کے غیر محدود ہونے اور سرمایا دارانہ نظام کیلئے حیلہ بن جانے کے انسدادی قوانین موجود نہ ہوں لیکن جب اسلام انفرادی ملکیت کو محدود صورت میں تسلیم کرنے کے بعد اقتصادی نظام میں ایسی دفعات قانونی بھی بیان کرتا ہے۔ جو انفرادیت کو اجتماعیت پر قابو پانے سے روکتی اور سرمایہ دارانہ نظام کا سر کچلنے کے لئے اپنے قانونی تیشہ سے کام لیتی رہتی ہیں۔ تو پھر ایک وہمی اندیشہ کی بناء پر انسانوں کو ان کے فطری حق سے روک دینا ظلم ہے۔ اور راہِ عدل سے ہٹ کر افراط و تفریط کے غار میں گر جانا ہے۔

دوسرا اختلاف "معیشت کے درجات سے" متعلق ہے۔ اسلام حقِ معیشت کی مساوات کو تو تسلیم کرتا بلکہ ضروری قرار دیتا ہے۔ لیکن مدارجِ معیشت میں مساوات کا قائل نہیں ہے یعنی وہ اس کو نہیں مانتا کہ یہ ضروری ہے۔ کہ سب کو ایک ہی طرح پر سامانِ معیشت حاصل ہو۔ لیکن یہ ضروری سمجھتا ہے۔ کہ سب کو ملے اور جد و جہد اور ترقی کی راہیں یکساں طور پر سب کے سامنے کھل جائیں۔ اس کے برعکس سوشلزم حقِ معیشت کی مساوات کے ساتھ ساتھ نفسِ معیشت کی بھی مساوات کا

قائل ہے۔ اور مدارج معیشت کا قطعاً انکار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ احوال معیشت کا یہ اختلاف قدرتی نہیں ہے۔ بلکہ سوسائٹی کا خود پیدا کردہ ہے۔ پس اگر آئیندہ سوسائٹی کا نظام معیشت مساوات کے اصول پر قائم کر دیا جائے تو دوسری طرح کے محرکات ذہنی پیدا ہو جائیں گے۔ اور کارخانۂ معیشت کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں گی جس طرح آج جاری ہیں۔

اس دوسری صورت اختلاف کو بھی غائر نظر سے دیکھا جائے۔ تو اقرار کرنا پڑے گا کہ اس میں بھی اسلام کی بتائی ہوئی راہ ہی صحیح ہے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام انسانوں کی جسمانی و دماغی استعداد یکساں نہیں ہے۔ اور جب استعداد یکساں نہیں ہے۔ تو سعی معیشت کے نتائج و ثمرات کا اختلاف بھی ضروری اور ناگزیر ہے۔ اور ایسی صورت میں سوسائٹی کا ایسا نظام قائم کرنا جسکی بنیاد معیشت کی مساوات پر ہو کسی طرح بھی صحیح اور درست نہیں ہے۔ اور یہ کہنا بھی ناقابل قبول ہے۔ کہ اس قسم کے نظام کے بعد ذہنی و معنوی محرکات میں بھی ایسی تبدیلی ہو جائے گی کہ جس سے معیشت کا کارخانہ اسی سرگرمی سے جاری رہے گا۔

بہرحال جسمانی و دماغی استعداد کے اختلاف کو مان لینے کے بعد معیشت کا اختلاف بھی فطری ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن عزیز نے اس طرف رہنمائی کی ہے۔ کہ یہ اختلاف قدرتی ہے۔ اور کارخانۂ عالم کی فطری قوتوں کے ابھرنے اور ترقی پانے کے لئے ایسا ہونا ضروری تھا اگر یہ نہ ہوتا تو سب کی حالت یکساں ہوتی تو مسابقت اور مزاحمت کی حالت کبھی پیدا نہ ہوتی اور ان قوتوں کو ابھرنے کا موقع کبھی نہ ملتا۔ اور اگر یہ موقع میسر نہ آتا تو اجتماعی زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں سرد ہو کر رہ جائیں جس پر نظام عالم کا یہ کارخانہ چل رہا ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (نحل)	اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے۔
نحن قسمنا بينهم معيشتهم في الحيوٰة الدنيا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجٰت۔ (زخرف)	ہم نے دنیوی زندگی میں ان کی معیشت تقسیم کر دی اور اُن سب کو یکساں درجہ میں نہیں رکھا۔ بلکہ بعض کو بعض پر برتری دی ہے۔
وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتٰكُمْ إِنَّ رَبَّكَ	اور وہی ہے جس نے تم کو زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دئے۔ تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے۔ اس میں تمہیں آزمائے بلاشبہ

سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (فاطر) تمہارا پروردگار (بدعملیوں کی) فوراً سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ وہ بڑا ہی بخشش دینے والا رحمت والا ہے۔

ان تمام آیات میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ انسانی زندگی کے اس چکر میں ایک دوسرے کی جانشینی کا سلسلہ قائم ہے۔ یعنی ایک جاتا ہے۔ دوسرا اسکی جگہ لے لیتا ہے۔ اور اس کے ثمرات کا وارث بنتا ہے۔ اور یہ کہ تمام انسان درجہ کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ معیشت کے مدارج کا یہ تفاوت اس لئے قائم کیا گیا ہے۔ تاکہ انسان کو اس کے عمل و تصرف میں آزمایا جائے اور اسکو یہ موقعہ دیا جائے کہ جس درجہ کو وہ اپنی سعی عمل سے حاصل کر سکتا ہے کرے اور یہ بھی امتحان لیا جائے کہ وہ ان تفاوت درجات کی موجودگی میں کس حالت میں خدا سے غافل رہتا ہے۔ اور کس حالت میں نہیں رہتا۔

الحاصل اسلام کے اقتصادی نظام اور سوشلزم کے اقتصادی نظام کا مقصد اگرچہ ایک نظر آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ عام انسانی افراد کی مالی تباہی، افلاس اور بدبختی کو دور اور ان کی بھاری اکثریت کی بدحالی کو ختم کیا جائے اور دونوں نے علاج بھی ایک ہی تجویز کیا ہے۔ کہ مذموم سرمایہ داری کو بروئے کار نہ آنے دیا جائے یعنی "جمع دولت" اور اکتناز کو باقی نہ چھوڑا جائے لیکن طریق کار میں دونوں کے درمیان یہ دو بنیادی اختلاف ضرور پائے جاتے ہیں۔ کہ ایک معیشت کے اختلاف کو قبول کرتا اور انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور دوسرا ان دونوں کا انکار کر کے ان کو فنا کرنا چاہتا ہے۔

اسلام نے حق معیشت کی مساوات کو تسلیم کیا اور سعی و ترقی کی راہیں سب کے لئے یکساں طور پر کھلی رکھیں اور اس نے احتکار کی وہ تمام رکاوٹیں ختم کر دی جن کی بدولت خاص افراد یا گروہ نے کمزور افراد اور گروہ کی خوشحالی و ترقی میں قائم کر رکھی تھیں، اس نے قانون سازی کے ذریعہ زکوٰۃ اور وراثت اور بعض تجارتی اصول کو لازم قرار دے کر اور سود اور قمار اور اس قسم کے تمام کاروبار کو ناجائز بنا کر اکتناز و احتکار کو فنا کر دیا اور تمام ایسی غیر معتدل راہوں کا سدباب کر دیا جو ظالمانہ سرمایہ داری کا موجب بنتی ہیں۔

ان تفصیلات کے ساتھ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سوشلزم کے مسطورہ بالا ہر دو اصول دراصل اس نظام اور اس سوسائٹی بلکہ اس مذہبی گروہ کے مقابلہ میں انتقامانہ جذبات کے ماتحت اصول قرار پائے ہیں۔ جن کے ظالمانہ ماحول سے متاثر ہو کر کارل مارکس اور انگلز نے اپنے نظریوں اور ان کے ماتحت عملی سرگرمیوں کا اختراع کیا ورنہ یہ ہر دو اصول نہ عملی تجربہ کی خراد پر ٹھیک اترتے ہیں اور نہ عقلی دلائل کی روشنی میں صحیح نظر آتے ہیں۔ اور اس لئے راہ حق کے قطعاً خلاف اور اعتدال کے منافی ہیں ■■

مولانا محمد اسحاق بھٹی ۔ لاہور
رفیقِ اعزازی الحق

چند لمحے مجلس اولیاء میں

سعد بن عامر بن خریم کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حمص کا گورنر مقرر کیا۔ اہلِ حمص کو ان سے شکایت پیدا ہوئی اور انہوں نے حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہو کر سعد کی علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ یا اللہ! اہلِ حمص کے بارے میں میری فراست کو دھوکا تو نہیں ہوا۔؟ پھر فرمایا کہو، اہلِ حمص تم کیا شکایت لے کر آئے ہو۔؟

انہوں نے کہا۔ "یہ گورنر گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ اور اس وقت ہمارے پاس آتا اور گھر سے باہر نکلتا ہے۔ جب سورج بہت اونچا ہو جاتا ہے۔ پھر رات کو یہ ہماری کسی بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں یہ مہینے میں ایک دن گھر سے مطلق باہر نہیں نکلتا۔ اور ہمارے پاس نہیں آتا۔

حضرت عمرؓ نے حکم دیا۔ کہ سعد کو حاضر کیا جائے۔ جب گورنر حمص اور اہلِ حمص دربارِ فاروقی میں جمع ہوئے، تو امیر المومنین عمر فاروق نے اہلِ حمص کو مخاطب کر کے کہا، اب اس کے سامنے بتاؤ۔ تمہاری شکایت کیا ہے۔؟

انہوں نے وہی بات دہرائی اور کہا۔ "یہ گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ اور اس وقت ہمارے پاس آتا ہے جب سورج بہت اونچا ہو جاتا ہے۔"

حضرت عمر نے سعد سے کہا۔ "سعد! بتاؤ اس کا کیا جواب ہے۔؟

سعد نے کہا۔ "امیر المومنین! میرے گھر میں کوئی خادم اور نوکر نہیں ہے۔ پہلے میں آٹا گوندھتا ہوں۔ پھر اس انتظار میں بیٹھ جاتا ہوں کہ وہ خمیر چھوڑ دے۔ اس کے بعد روٹی پکاتا ہوں۔ پھر وضو کرتا ہوں۔ اور ان کے پاس باہر آ جاتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے کہا۔ "اہلِ حمص! تمہیں سعد سے اور کیا شکایت ہے۔؟

انہوں نے کہا۔ "یہ رات کو ہماری کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔"

سعدؓ نے جواب دیا۔ "میں اس سلسلہ میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ بات یہ ہے کہ میں نے رات کو اپنے اللہ کی یاد کے لئے اور دن کو ان لوگوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے پوچھا "اور کیا شکوٰی ہے۔؟

انہوں نے کہا۔ "یہ مہینے میں ایک دن ہمارے پاس قطعی طور سے آتا ہی نہیں۔ اور تمام دن گھر میں بیٹھا رہتا ہے۔ حالانکہ یہ ہمارا محافظ ہے۔"

سعدؓ نے کہا۔ "یہ ٹھیک کہتے ہیں۔ معاملہ یہ ہے۔ کہ میرے پاس کوئی خادم نہیں ہے۔ میں خود ہی اپنے کپڑے دھوتا ہوں، پھر انہیں خشک کرتا ہوں، اتنی دیر میں شام ہو جاتی ہے۔"

حضرت عمرؓ نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ کہ میری فراست نے اہل حمص کے بارہ میں مجھے دھوکا نہیں دیا۔ تم اپنے گورنر کے لئے بہتری کی دعا کرو۔ پھر عمرؓ فاروق نے سعدؓ کو ایک ہزار دینار بھیجے اور کہا۔ اس سے اپنی ضروریات پوری کرو۔

ہزار دینار دیکھ کر سعدؓ کی بیوی نے شوہر سے کہا۔ "اللہ نے ہم کو آپ کی خدمت سے بے نیاز کر دیا ہے۔

سعدؓ نے کہا: کیا ہم یہ دینار اس شخص کو نہ دیدیں جو ہم سے بھی زیادہ ان کا محتاج و مستحق ہو۔

بیوی نے جواب دیا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔"

پھر انہوں نے اس کے چند حصے کئے اور کہا۔ میں یہ حصہ فلاں شخص کو دے دیتا ہوں۔ یہ حصہ فلاں یتیم لڑکی کے حوالے کر دیئے۔ صرف چند ایک باقی رہ گئے۔ یہ بیوی کے حوالے کر دئے اور کہا، انہیں کہیں خرچ کر ڈالو۔ اور خود کام میں مصروف ہو گیا۔

بیوی نے کہا: کیا یہ بہتر نہیں ہو گا۔ کہ ہم اس سے ایک خادم خرید لیں۔؟

کہا: نہیں، اسے اپنے پاس رکھو۔ تمہارے پاس بہت ہی زیادہ ضرورت مند اور محتاج شخص آئے گا۔ اس کو دے دینا۔

(مروج الذھب جلد ۲۔ طبع بغداد صفحہ ۱۹۹)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مشہور صحابی تھے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدائن کے عامل و گورنر تھے۔ یہ صوف کا موٹا کپڑا پہنتے اور بغیر زین کے گدھے پر سوار

ہوتے تھے ۔ جَو کی روٹی کھاتے تھے ۔ نہایت زاہد اور عبادت گذار تھے ۔ جب یہ گورنر مقرر ہو کر مدائن آئے تو سعد بن وقاص نے کہا ۔" اے ابو عبداللہ! ۔ کہا، جی ! ۔ فرمایا ان مواقع پر اللہ کو یاد رکھو ۔

جب کسی بات کا عزم و ارادہ کرو ۔

جب زبان سے کوئی فیصلہ صادر کرنے لگو ۔

جب ہاتھ سے کوئی چیز تقسیم کرنے لگو ۔

سلمان فارسی نے یہ سنا تو رونے لگے ۔

سعد بن وقاص نے کہا ۔"کس بات نے تمہیں رونے پر مجبور کیا ۔؟

کہا ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے ۔ آخرت میں ایک گھاٹی ہے ۔ اُسے وہی لوگ طے کر پائیں گے جو ساز و سامان کے اعتبار سے ہلکے پھلکے ہوں گے ۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ یہ ساز و سامان میرے ارد گرد بکھرا پڑا ہے ۔" لیکن جب ہم نے اس سامان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ ایک دوات ، ایک لوٹے اور ایک آبخورے پر مشتمل تھا ۔

(مروج الذھب جلد ۲ صـــ ۲۰۰)

جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ مقرر ہوئے تو ان کے پاس سالم سدی آئے جو انکے مقرب خاص تھے ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان سے پوچھا ۔ یہ مسندِ خلافت جو میرے سپرد کی گئی ہے ، اس پر تم خوش ہو یا اسے نامناسب قرار دیتے ہو ۔؟ انہوں نے جواب دیا ۔" میں اسے لوگوں کے حق میں تو اچھا سمجھتا ہوں لیکن اسے آپ کی ذات کے لئے غیر موزوں سمجھتا ہوں ـــ یہ سُن کر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا ۔ مجھے یہ خطرہ لاحق ہے ۔ کہ میں اپنے آپ کو کہیں ہلاکت میں نہ ڈال لوں ۔

سالم سدی نے کہا :" اگر آپ یہ خطرہ محسوس کرتے ہیں ۔ تو بڑی اچھی بات ہے لیکن مجھے یہ خوف لاحق ہے ۔ کہ آپ کے دل میں اس خطرہ کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا ۔ فرمایا ۔ مجھے کوئی نصیحت کیجئے ۔ کہا ، ہمارے باپ آدمؑ کو ایک ہی غلطی کی بنا پر جنّت سے نکال دیا گیا تھا ۔

(مروج الذھب جلد ۳ طبع بغداد صـــ ۱۱۲)

حضرت طاؤس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خط لکھا ۔ کہ " اگر آپ یہ چاہتے ہیں ۔ کہ آپ کے تمام تر اعمال اچھے ہوں تو عوام پر نیک لوگوں کو حاکم مقرر کیجئے ۔" خط پڑھ کر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا ۔

" یہ نصیحت بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔"

(مروج الذھب جلد ۳ صـــ ۱۲۰)

از قلم مولانا محمد اشرف صاحب ایم اے
صدر شعبۂ عربی اسلامیہ کالج پشاور
رفیقِ اعزازی الحق

(۲)

موجودہ دینی انحطاط اور اس کا بڑا سبب

اس لیئے علمی محاذ پر سب سے پہلی ضرورت ان مفروضہ علمی حقائق و یقینیات کا تجزیہ ہی بتایا جائے کہ ان علوم کا اکثر حصہ محض ظن و تخمین، قیاسات اور اوہام پر مبنی ہے۔ اور علوم انسانی کا وہ حصہ جسے تاریخی تواتر اور متوارث تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر یقینیات کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ وہ بھی ہر آن تغیر و تبدل کا محل، اور اشیاء کی اصل حقیقت جاننے سے قاصر ہے۔ (خواص اشیاء کا جاننا اور بات ہے اور حقیقت اشیاء کا جاننا اور) اس بنا پر ایمانی حقائق اور دینی مسلمات کا مدار ان ظنوں و قیاسات پر نہیں رکھا جا سکتا، ضرورت ہے کہ الٰہی علم کے محکم، یقینی لامحدود اور پائیدار ہونے کو ثابت کیا جائے، اور انسانی علوم پر اسکی فوقیت جتائی جائے، اور ان علوم کے اس حصہ کی تنقید و ابطال کیا جائے۔ جو الٰہی یقینی علوم سے ٹکراتے ہیں، اس سلسلہ میں یہ بات واضح کر دینی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ انسانی ظنی علوم کے صرف اسی حصہ کی نشاندہی اور رد ضروری ہے۔ جو دینی حقائق سے ٹکراتا ہو، ورنہ جو حصہ دین سے نفیاً یا اثباتاً مخالف نہیں۔ اس کے درپے ہونا سعی لاحاصل ہے۔ غرض ایک طرف انسانی علوم کے ارتقاء کی تاریخ، ان کا تجزیہ ان کا ظنی ہونا اور الٰہیات کے بارے میں اس کی نارسائی اور بیچارگی اور انسانی مسائل کے حل کرنے میں اس کی ناکامی کو واضح کیا جائے۔ تو دوسری طرف الٰہی علوم کی حقیقت و اہمیت، انسانوں کی رہنمائی کے لئے اس کی ضرورت اس کا یقینی اور غیر متبدل ہونا اور انسانی مسائل کا صحیح و دائمی حل انہیں سے ثابت کیا جائے، الٰہیات کے بارے میں عصر نو کی بے بصری انسانی کمالات و جواہر اصلیہ کی ناشناسی اور اس کے ضیاع کی کوششوں کی نشاندہی کی جائے اور یہ بات واضح کر دی جائے کہ صنعت اشیاء کا اپنا میدان ہے، اور انسانی جواہرات کے چمکنے کا دوسرا محل ہے۔ آج مادہ و اشیاء بن رہی ہیں۔ اور انسان انسان کی حیثیت سے مٹتا چلا جا رہا ہے۔ انسان کائنات کے ظواہر

کی تسخیر میں کسی مقام پر پہنچ جائے، اس کا علم الہیات کے حقائق اور سچائیوں کے جاننے سے قاصر رہے گا، کہ یہ علوم و حقائق حریم نبوت کے دائرے و حدود سے باہر کسی پر نہیں کھولے جاتے۔ جیسے بصارت سے محروم شخص کسی چیز کی رویت سے محروم رہتا ہے۔ اسی طرح نبوی بصیرت ہی پر الہیات کا باب کھولا جاتا ہے۔ اور پھر دنیا میں جسے ملتا ہے، انہیں کے واسطے ملتا ہے۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ موجودہ علوم و فنون کی تابانی کی بنا پر نبوی علوم کا انکار، الہی حقائق کا ابطال، عقائد دینیہ کا رد۔ ناواقفیت، جہالت، تقبیح ناشناس اور خود اس علم کا بے محل استعمال، ناانصافی اور ظلم و زیادتی ہے۔ ان علوم کا دائرہ الہی اور دینی علوم سے جداگانہ و علیحدہ ہے۔ کہ اگر ان انسانی علوم کی رسائی الہی حقائق، غیبی و روحانی رموز و دقائق، دینی صداقتوں اور نبوی علوم تک کسی صورت میں بھی ہوسکتی اور انسان پر اللہ تبارک و تعالی کی معرفت اور الہیات کے دیگر مسائل اس کی عقلی و تجرباتی قیاسی اور ظنی کوششوں سے کھل سکتے تو انبیاء کی بعثت کی قطعاً ضرورت نہ تھی، نبوت موہبت و اجتباء ہے۔ کسب و تجربہ عقل و ظن کا اس میں کوئی دخل نہیں، اس لئے دنیاوی علم و فہم "تجربہ و عقل" کے آسمانوں پر اڑنے والے اور سورج اور چاند پر رسائی پانے والے اذہان "الہیات کی دنیا" اور معرفت و عرفان کے عالم میں اندھے اور بہرے ہوجاتے ہیں، یہی وہ حقیقت ہے۔ جسے نہ سمجھنے کی بنا پر ہمارا ایک اچھا خاصہ طبقہ دینی حقائق اور الہی صداقتوں کے بارے میں مذبذب اور شک و ریب میں مبتلا ہوگیا ہے۔ ضرورت ہے کہ طبیعات و الہیات کے دوائر اور انسانی اور نبوی علوم کی حدود کو متعین کیا جائے، آج بھی موجودہ علوم و سائنس کے ماہرین کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا وہ قول صادق آتا ہے۔ جو قدیم طبیعین و فلاسفہ کے متعلق انہوں نے کہا تھا:

نعم لهم في الطبيعيات كلام غالبه جيد وهو كلام كثير واسع - ولهم عقول عرفوا بها ذلك وهم قد يقصدون الحق لا يظهر عليهم العناد ولكنهم جهال بـ "العلم الالهي" الى الغاية ليس عندهم الا قليل كثير الخطاء. (كتاب الرد على المنطقيين ص۱۴۳ ابن تيميہؒ)	فلاسفہ و طبعین کا طبیعیات کے بارے میں جو کلام ہے اس کا غالب حصہ عمدہ ہے۔ اور یہ کلام کثیر و وسیع ہے۔ ان کی عقلوں نے ان علوم کو جانا ہے۔ اور وہ اس بارے میں حق کا قصد کرنے والے ہیں۔ اور عناد ظاہر نہیں کرتے۔ لیکن علم الہی کے بارے میں غایت درجہ جاہل ہیں۔ اور ان کے پاس علوم الہیہ کا بہت ہی قلیل اغلاط سے بھرا ہوا حصہ ہے۔

دانش حاضرہ کے فریب نے دین وایمان کے نور کو جس طرح سلب یا مضمحل کر دیا ہے۔ اس کے علاج و مداوا کے لئے سب سے اہم واقدم ضرورت ایمانیات کی تجدید و رسوخ کی ہے۔ ایمان و یقین کی ضرورت واہمیت، اس کی قیمت و وقعت، اس کی حقیقت و افادیت، اس کے حصول کے طرق و ذرائع کی تعین و ترتیب کو نئے طرز سے واضح و مبرہن کرنا ہے۔ قرآن کریم واحادیث نبویہ کے ان گوشوں کو سامنے لانا ہے۔ جو تجدید ایمان کی اس کوشش میں عصر حاضر کے لئے ضروری ولابدی ہیں۔

تجدید ایمان و یقین کی اس کوشش میں جتنا بھی سنجیدہ اور معیاری لٹریچر انگریزی، عربی، اُردو وغیرہ میں مرتب کیا جائے، اور جدید طبقہ میں پھیلایا جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ نفع سے خالی نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ذہنی سطح کے مختلف مدارج اور دین وایمان کے تفاوت اور الحاد وارتیاب کی متفرق منازل اور دیگر معلوم وجوہ کی بنا پر اس قسم کی کتابوں میں کم وکیف، مغز و پوست کے لئے ہر لحاظ سے تنوع لازمی ہے۔ تاہم ایک بات سب میں مشترک ہونی چاہیئے۔ وہ ایمان و یقین کا احیاء، حقائق دینیہ، مغیبات اور اسلام کے ابدی ہونے پر غیر متزلزل عقیدہ کا پیدا کرنا ہے۔ یہ کتب ذات باری تعالیٰ کی ذات وصفات کے اثبات اور اسلامی نظریہ توحید و رسالت امت کی بعثت کی اہمیت سے لے کر معاد، حیات بعد الموت و دیگر اہمات عقائد تک اور آسمانی مذاہب وادیان کی عمومی ضرورت اور ان میں اسلام کی فوقیت سے لے کر وحی و نبوت کی حقیقت وغیرہ صدہا مضامین پر مشتمل ہو سکتی ہیں۔ حجم کے لحاظ سے بھی بڑی چھوٹی اور مقبول کتابوں میں ان حقائق کو مختلف صورتوں اور طریقوں سے بیان کیا جائے، کہ حق و یقین کی یہ صدا ہر ایک کان تک پہنچ جائے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ کہ مغرب کی عمومی استیلاء، اور معاشی ضروریات نے ان علوم وفنون کا حصول ایک حد تک ناگزیر کر دیا، اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ کس طرح ان علوم کے منفعت والے پہلوؤں سے فائدہ اٹھایا جائے، اور مفسد اثرات سے بچنے کی کیا کیا صورتیں اختیار کی جائیں۔

خذ ما صفا ودع ما کدر۔ مجھ جیسے ہر مبتدی کا کام نہیں، بلکہ بقول مولانا رومؒ ؎

مرغ پر نارستہ چوں پراں شود   طعمہ ہر گربۂ دراں شود

مزید براں ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ آج صرف طبعی علوم کی مختلف شاخوں یا دیگر علوم ہی کو اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی، بلکہ علوم کے حصول سے پیشتر اپنی تہذیب و تمدن، ثقافت وشعائر یہاں تک کہ عبادات و اخلاق طرز ماند و بود تک کو خیر باد کہہ دیا جاتا ہے۔ اسلام

محض عقائد یا چند تعبدی رسوم کا نام نہیں، بلکہ اپنی خاص تہذیب و معاشرت اور طریقۂ حیات بھی رکھتا ہے۔ جو زندگی کے جزو کل پر حاوی ہے، جب معاشرت و تہذیب اخلاق و ثقافت چھوڑ دی جاتی ہے۔ تو اس کے ساتھ زندگی کی بے شمار اسلامی حقیقتیں بھی گم ہوجاتی ہیں، بہرحال ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے امت کو ایک عظیم اور ہمہ جہتی لائحہ عمل اختیار کرنا ہے۔ کہ نئی پود جدید تعلیم یافتہ اور امت کا ذہین گروہ اسلام ہی کی رونق اور قوت کا سبب بنے۔ اور ہمیں یہ نہ کہنا پڑے ۔۔۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشہ کن کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

اس سلسلے میں پہلا قدم اسلامی ممالک میں نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلی کا ہے۔ ہمارے نظام تعلیم کی خشت اول اور بنیادی نقطۂ امت میں دین کے بقا دینی زندگی کے احیا اور عالم میں دین کی اشاعت و فروغ ہونا چاہیے۔ اور اس کے ساتھ دوسرے عمرانی، معاشی اور طبعیاتی علوم اس نہج سے پڑھائے جائیں کہ وہ علوم ہماری اسلامی زندگی پر مضر اثرات نہ ڈال سکیں۔ ہم ان علوم کو اسلام کا خادم اور مسلمانوں کی دنیاوی معیشت کا مددگار سمجھ کر حاصل کریں، نہ کہ وہ ہماری زندگی کا مقصد اور نصب العین اسطرح بن جائیں کہ ان کی غلط طلب میں دین کا چشمۂ حیات ہی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوجائے۔ اور ذریعہ کے حصول میں مقصد بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔

اس کے لئے ہمیں ابتدائی جماعتوں سے لیکر بی۔ اے تک اسلامی تعلیم ہر طالب علم کے لئے ایک مضمون کے طور پر لازمی قرار دینی ہوگی، اور محض ضابطہ اور اشک شوئی کے لئے دینیات کا مضمون نہیں پڑھانا ہوگا۔ بلکہ جملہ علوم میں اسے ممتاز اور نمایاں حیثیت دینی ہوگی۔ اسکی اہمیت و فوقیت کو واضح کرنا ہوگا، کہ اگر ہم اپنی آئندہ نسلوں کو اسلام پر قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے سوا چارہ کار نہیں ۔۔۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

دینیات کا نصاب اس طرح مرتب کیا جائے کہ تمام ضروری اسلامی علوم سے ایک گونہ واقفیت حاصل ہوجائے۔ اور اگر کوئی شخص بعد میں ان علوم کی کسی شاخ میں تکمیل و مہارت حاصل کرنا چاہے تو آسانی سے کر سکے۔ ذریعہ تعلیم پانچویں تک ملکی زبان ہو، اور اس کے بعد عربی کو اسطرح شریک نصاب کیا جائے کہ فوقانی جماعتوں تک پہنچتے ہوئے عربی زبان میں دینیات کی کتابیں

پڑھی جاسکیں، تفصیلات کا یہ پیغام نہیں۔ ماہرین تعلیم و علماء مناسب نصاب تعلیم، طریق کار اور لائحہ عمل بنا سکتے ہیں، جہاں مسلمان محکوم ہیں، وہاں مساجد و مکاتب کا منظم نظام اس کمی کو پورا کرسکتا ہے۔

تعلیم کے ساتھ دوسری اہم بات تربیت ہے۔ صحیح اسلامی تربیت کے فقدان اور اسلامی معاشرہ کے اضمحلال نے امت کے کثیر طبقہ کو دین سے بیگانہ کر دیا ہے۔ تربیت کے لئے صحیح اسلامی ماحول و معاشرہ پیدا کرنا امت کا فریضہ ہے۔ جدید طبقہ کے لئے اس کمی کو دارالاقاموں کے قیام سے ایک حد تک دور کیا جاسکتا ہے۔ جن کالجوں، سکولوں یا یونیورسٹیوں میں اقامتی و رہائشی سہولیات ہیں وہ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان ہاسٹلوں میں رہنے والے طلبار کو اسلامی ذہن و عمل، دین کا درد و فکر رکھنے والے سنجیدہ و متین، شفیق اساتذہ کی نگرانی میں رکھا جائے۔ طلبہ کو ان کی درسی کتابوں کے مطالعہ اور اپنے خاص مضمون کی تیاری کے علاوہ باقی اوقات میں ایسے مشاغل میں مصروف رکھا جائے جو ان کی جسمانی و علمی نشوونما کے ساتھ ان کی روحانی اور اسلامی زندگی بنانے میں ممد و معاون ہوں، طلبار کی دینی تعلیم و تربیت کا کما حقہٗ بندوبست کیا جائے۔ ان کے افعال و اعمال کی نگہداشت کی جائے، ان میں ہر قدم پر اسلام کی عظمت کا احساس، دینی شعور، دینی دعوت کا قوی داعیہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ کم ازکم اسلامی فرائض و واجبات کی پابندی لازمی قرار دی جائے۔ منہیات و فواحش اور اس کے لوازمات و دواعی کے اشتغال سے روکا جائے۔ اس سلسلہ میں جبر و اکراہ کی بجائے رافت و شفقت، محبت و راحت کی راہ اختیار کی جائے، اور نبوی طرز کے مطابق ترغیب و تشویق سے اعمال دینی کی رغبت پیدا کی جائے۔ اور حکیمانہ ترہیب و تنذیر سے برائیوں کی نفرت پیدا کرائی جائے۔

ان میں امت کے فریضہ منصبی کی اہمیت اور اس کی ادائیگی کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے تبلیغ و دعوت کی مجالس اور اس کی عملی مشق کی ہمت افزائی کی جائے۔ ہوسکے تو چھٹیوں کے اوقات میں دینی دعوت کے لئے جماعتیں بنا بنا کر بھیجا جائے (جیسا کہ آجکل سوشل ورک کیلئے طلبار جاتے ہیں۔) اور وہ دین کی ابتدائی اور بنیادی متفق علیہ باتوں ہی کی دعوت دیں۔ اختلافی اور مشکل مسائل کا تذکرہ نہ کریں۔ دعوت سے ان کی اپنی تربیت بھی ہوگی اور جن دیہات میں جائیں گے، ان کی اصلاح کی بھی انشاء اللہ صورتیں پیدا ہوں گی، اگر امت ان تجاویز کو حکمت و دانائی، ہمت و جرأت، محنت و استقامت سے اپنانے کی کوشش کرے، تو ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے

کی توفیق و نصرت سے بے دینی و الحاد کے موجودہ سیلاب کو روک دے۔ اور نئی پود الحاد و ارتداد سے بچ سکے، اصحاب فکر و درد اس بارے میں اس سے اچھی تجاویز پیش کر سکتے ہیں مقصود اصلاح ہے، اللہ تعالیٰ امت کی اس فتنۂ عظیم میں مدد فرمائے، اور ہمیں اس سیلاب کے رُخ کو ہدایت کیطرف پھیر دینے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

یہاں ضمناً ایک دوسرے خطرے کی طرف بھی اشارہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں، مسیحیت دینی حیثیت سے اپنی تمام قوت وکشش وحقانیت کھو چکی ہے لیکن مغربی استعمار و استیلاء کے زیر سایہ آج عیسائی مشنری اسلامی ممالک میں تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں کے ذریعہ سادہ لوح جاہل مسلمان عوام کو جسطرح بہکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ایک اندوہناک المیہ اور ملت کی بے حسی کا ثبوت ہے۔ مشنری مفلوک الحال اور مصیبت زدہ طبقات میں اپنی دعوت مالی امداد اور دیگر دنیاوی لالچوں کے ذریعے پھیلاتے ہیں۔ ہیچمداں نے اُردن میں فلسطینی مہاجرین میں اور مشرقی بنگال کے سیلاب زدہ لوگوں میں ان کے انہیں طریقوں کو دیکھا ہے۔ ہسپتالوں میں ان کی ظاہری خوش خلقی اور خدمت کے پیچھے یہی گھناؤنا مقصد کام کر رہا ہوتا ہے۔ مشنری تعلیمی ادارے ہمارے معصوم بچوں کے ذہنوں کو جسطرح مسموم کرتے ہیں اور امت کے اندر "ایک غیر ملکی ذہن" والا طبقہ پیدا کرتے ہیں، کوئی پوشیدہ بات نہیں، ہمارا مطالبہ صرف اتنا ہے۔ کہ اگر وہ اسلامی ممالک کی امداد کرنا چاہتے ہیں تو ہسپتال، تعلیمی ادارے، اور امداد کی دوسری صورتیں وہ ملک کی حکومت کے حوالہ کر دیں۔ اور یہ ادارے قومی تحویل میں کام کریں اور یہ امداد سرکاری ذرائع سے تقسیم ہو، پھر اگر وہ اپنی دعوت و تبلیغ میں مصروف بھی رہیں گے تو اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ ◆◆

بقیہ: اسلام متجددین کے نرغے میں

کے محدود دائرہ میں اپنی آخری جائے پناہ بنائی یعنی شادی، طلاق، وراثت اور ان سے متعلق مسائل جو کہ مذہبی عدالتوں میں فقہا کے ذریعہ فیصل ہوتے تھے۔ ترکی پہلا ملک تھا جس نے اسطرح کی مذہبی عدالتوں کو ختم کیا۔ مذہبی عدالتوں کے خاتمہ کے ساتھ تعدد ازدواج کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ تیونس کی نئی سلطنت نے حبیب بورقیبہ کی قیادت میں ۱۹۵۶ء میں اس کی پیروی کی۔ مگر رمضان میں مہینہ بھر کے روزہ کو ختم کرنے کے سلسلہ میں اس کی کوشش ناکام ہو گئی۔ مصر نے ۱۹۵۹ء میں ایک کم تر درجہ کا انقلابی قدم اٹھایا جبکہ اس نے مذہبی عدالتوں کو ختم کر دیا، اور یہ حکم دیا کہ تمام مقدمات عام ملکی عدالتوں میں سول ججوں کے سامنے پیش ہوں گے۔ البتہ ذاتی نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ مذہبی قانون کے مطابق کیا جائے گا۔

اسلام متجددین کے نرغے میں

از فلپ کے ہٹی — ترجمہ : وحید الدین خان صاحب

اسلام اینڈ دی ولیسٹ کے نام سے مشہور انگریز مصنف اور مؤرخ فلپ کے ہٹی کے ایک اہم مضمون کا ترجمہ الفرقان لکھنؤ میں شائع ہوا ہے۔ یورپ کے نظریات اور مغرب کے ٹکنالوجی تصورات کی وجہ سے اسلام میں جن تبدیلیوں کی کوشش کی گئی اس کا شکار صرف اسلامی کلچر اور اسلامی ریاست بلکہ اسلام کے نئے تعبیر و تشریح کرنے والوں نے اسلام کا مغز۔ دینیات اور قانون شریعت تک کو مسخ کرنے کی کوششیں کیں۔ آج بھی ہمارے ہاں کے متجددین اسلام کا نیا ڈھانچہ تیار کرنے پر مصر ہیں۔ ان مسلم ماڈرنسٹوں کے کارنامہ کے بارہ میں اس انگریز مؤرخ کے تاثرات پڑھئے۔ جو اسلام کی سپرٹ اور روح فنا کرنے کے سلسلہ میں ان لوگوں کو اہم مقام دے رہے ہیں۔

—— ادارہ ——

اسلام کے مذہبی حصّے کی باری سب سے بعد میں آئی۔ مندرجہ بالا تبدیلیاں بلاشبہ اسلام کے طریق زندگی سے انحراف کے بغیر نہیں آسکتی تھیں۔ مگر یہ تبدیلیاں بنیادی طور پر مذہب کی بیرونی سطح سے متعلق تھیں۔ اسلام کا مغز —— دینیات اور قانون شریعت —— اس کے بعد بھی کچھ دنوں تک محفوظ رہا۔

ان دونوں میں شریعت سب سے پہلے زد میں آئی۔ شریعت کو قرآن میں خدا کا کلام قرار دیا گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں نظم حکومت کی واحد بنیاد تھی۔ اور عرب میں دینی مختلف فرقوں کے درمیان وجہ اتحاد رہی ہے۔ اس لئے شریعت پر براہ راست حملہ مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ اس پر اطراف سے حملے شروع ہوئے۔ نئی تعبیر کرنے والے اور اصلاح کے علمبردار اور بالآخر متجددین (MODERNIZERS) نے بہت ہوشیاری کے ساتھ اس کے اجزاء پر ادھر ادھر سے اعتراضات کرنا شروع کئے وہ حدیثیں جو موضوع ہونے کے باوجود مجموعۂ احادیث میں شامل ہو گئی ہیں۔ اور اجماع ان دو چیزوں نے ان کو مقصد برآری کا اچھا موقع دے دیا۔ اور کسی مرکزی اور متفقہ مستند ترجمان نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اعتراضات کا موثر توڑ بھی نہ کیا جا سکا۔ ان مسلم ماڈرنسٹوں

کا طریقہ وہی تھا جو پیشتر عیسائیوں کا طریقہ تھا ——— قدیم متن میں نئے خیالات کو پڑھنا، عبارتوں کو ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے ان کا مفہوم بیان کرنا، یہ مصلحین ایران کے جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ — ۱۸۹۶) اور مصر کے محمد عبدہ (۱۸۴۹ — ۱۹۰۵) کی قیادت میں کام کر رہے تھے۔

ان کا طریقہ یہ تھا کہ بات کو اس مقدمہ سے شروع کریں کہ جدید سائنس اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں۔ اسلامی تعلیمات کی عقلی توجیہات کی جائیں۔ مگر ان کے پرجوش مقلدین مضحکہ خیز انتہا تک پہنچ گئے۔ مثلاً تعدادِ ازدواج کے متعلق قرآنی حکم (۴-۳) کے متعلق ان کا استدلال تھا کہ قرآن کہتا ہے۔ کہ "لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو۔" اب چونکہ کوئی شخص زیادہ بیویوں سے یکساں برتاؤ نہیں کر سکتا۔ اس لئے قرآن کے حکم کے مطابق صحیح شادی صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ سود کے خلاف حکم (۴، ۱۵۹ - ۱۵۷) جو کہ سرمایہ کاری اور بینکنگ کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ اس کی تشریح یہ کی گئی کہ وہ صرف بڑھے ہوئے سود کے بارے میں ہے۔ خدا کا فرشتوں سے یہ کہنا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں (انسان)" ۲ : ۲۸ نظریہ ارتقاء کی تصدیق کرنے والا بن گیا۔ قرآن کے "جن" وہی چیزیں ہیں جن کو آج ہم خوردبینی جرثومہ (MICROBES) کہتے ہیں۔ "حجارۃ من سجیل" جن کو چڑیوں کے غول (۳ : ۱۰۵) نے مکہ کے باہر حبشہ کی فوج پر برسایا۔ وہ چیچک کی وبا کا پھوٹ پڑنا تھا۔ یہی طریقہ اس سے بہت پہلے مسیحی شارحین نے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ کتابِ مقدس کا یہ بیان (37 - 36 - 15) کہ آشوری فوج جس نے یہود پر حملہ کیا تھا اس کو خدا کے فرشتہ نے برباد کر دیا، وہ دراصل طاعون کی وبا تھی۔ اور یہ کہ بائبل کی کتاب پیدائش میں تخلیق کے دن سے مراد ایک ارضیاتی دور (GEOLOGIC ERA) ہے[1]۔ متحدہ عرب جمہوریہ (U. A. R) کے وکیل جو کہ سوشلسٹ قانون سازی کے مدعی ہیں، اور جن کا دعویٰ ہے۔ کہ اس قسم کی قانون سازی قرآنی تعلیمات کے مطابق ہے۔ وہ اور ان کے سعودی اور یمنی مخالفین دونوں کو یکساں طور پر اپنے اپنے دعوے کے لئے قرآن سے دلائل مل گئے۔

ماڈرنزم اور سیکولرزم کی اس مسلسل یلغار کے بعد شریعت نے ذاتی زندگی (PERSONAL STATUS)

---

[1] تخلیق کے ایک دن کو ایک ارضیاتی دور سے تعبیر کرنا ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ اس لئے یہ بقیہ مثالوں کی فہرست میں نہیں آتی۔ اس کی تصدیق قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآن میں خدا کے دن کو انسانی دنوں کے اعتبار سے ہزار سال کے برابر کہا گیا ہے۔ اور عربی استعمالات کے اعتبار سے یہ ہزار سال بھی صرف زیادتی کے مفہوم میں ہے نہ کہ بالکل حسابی قسم کا ہزار سال۔ (وحید الدین)

مولانا محمد سالم قاسمی
ابن مولانا قاری محمد طیب قاسمی مدظلہ

تعارف

مجلس معارف القرآن

دارالعلوم دیوبند

تاریخِ ہند کا جو دور مغل سلطنت کے ساتھ ختم ہوا وہ ایک طرف ملّتِ اسلامیہ ہند کیلئے سیاسی، معاشی اور تمدنی ابتری کا المناک دور تھا تو دوسری طرف اسی دور میں ماضی قریب کی اسی خاکستر سے وہ چنگاریاں بھی فروزاں ہوئیں جنہوں نے ملّتِ اسلامیہ کو علم کی روشنی دی عمل کا حوصلہ بخشا، دین کا صحیح تصور عطا کیا اور اخلاق و روحانیت کی فضا پیدا کی۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں فرنگی اقتدار اور تسلط کے بعد امّتِ اسلامیہ ہندیہ کیلئے خاک پاک وطن اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود دینی اور اسلامی حیثیت سے تنگ ہو چکی تھی اور یہ تنگی وقتی اور ہنگامی نہیں تھی۔ بلکہ حالات کے تسلسل، تاریخ کی کروٹوں اور اقتدارِ وقت کی بھرپور کوششوں سے پیدا ہوئی تھی، لیکن اس تنگ ماحول اور گھٹی ہوئی فضا میں دینی و ملّی بقاء و استحکام کے لئے یگانۂ روزگار شخصیتوں کے ایک باحوصلہ، صائب الرائے، وسیع الفکر، بالغ نظر اور عہد آفرین طبقہ نے فکر ولی اللٰہی کے راس رئیس اور دانایانِ وقت کے سرخیل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کی فکری سیادت کے تحت بروقت یہ مستحکم فیصلہ کیا کہ ـــــ "ہندوستانی مسلمانوں کی دینی اور ملّی شیرازہ بندی کے لئے دینی تعلیمات کی اشاعت و عمومیت لازمی ہے، اس کے بغیر ملّت کا ہر قدم بے نتیجہ اور ہر اسکیم ادھوری رہے گی ـــ"

یہ فیصلہ متعدد جہات سے وقت و بخت کا بہت ہی اہم اور مبارک فیصلہ تھا، جو ملّت اسلامیہ ہند کی مستقبل گری میں انتہائی کارآمد ثابت ہوا۔ چنانچہ وقت و حالات کی مساعدت کا انتظار کئے بغیر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ العزیز نے اپنے جلیل القدر رفقاءِ کرام کے پرخلوص تعاون سے اپنے اس عظیم الشان فیصلہ کو "دارالعلوم دیوبند" کی شکل میں

۴۸

عملی جامہ پہنا دیا۔

۱۸۵۷ء رستخیز کے دس سال بعد ۱۸۶۷ء سے تادم تحریر دار العلوم دیوبند نے ملت اسلامیہ ہند کے دینی بقاء اور اسلامی ارتقاء کا جو فریضہ انجام دیا ہے۔ اس کو مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر پائے گی۔

دار العلوم دیوبند کا قیام یوں تو ایک دینی تعلیم گاہ کی حیثیت سے ہوا، لیکن درحقیقت اس نے ذہنی و فکری، علمی و عملی، دعوتی و اصلاحی، تہذیبی و ثقافتی اور انفرادی و اجتماعی خطوط پر ملتِ اسلامیہ ہند کی ہمہ جہتی تربیت و پرداخت کے مرکزی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی اور گذشتہ سو سالہ تاریخ میں اس نے جو دینی شعور مسلمانانِ برصغیر کو بخشا اور ایمانی حرارت و حدت کا جو سرمایہ بہم پہنچایا ہے۔ اس کے پیش نظر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اسی کی بدولت مسلمانانِ ہند اس صدی کے ہیجان انگیز سیاسی انقلابات اور ان کے ہولناک نتائج سے دوچار ہونے کے باوجود اپنی دینی و اسلامی زندگی کے ڈھانچے کو امکانی حد تک برقرار رکھنے میں ناکام نہیں رہے ہیں اور اسی استقامت کی بدولت آج بحمد اللہ دار العلوم کی دینی مرکزیت نہ صرف برصغیر ہند و پاک بلکہ تبت، سیلون، برما، سیام، ملایا، انڈونیشیا، افغانستان، ایران، ٹرکی، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقی افریقہ تک مسلّم و ناقابلِ انکار ہے۔

دار العلوم دیوبند کی اس علمی پیش رفت کے مقابلہ میں فرنگی اقتدار کے پیش نظر سیاسی استحکام حاصل کرنے کے ساتھ محکوم افراد کے دل و دماغ کو بھی مفتوح و مسخر کرنے کی اسکیم تھی، چنانچہ ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک انگریز دماغ نے برصغیر میں وہ شاطرانہ منصوبے اختیار کئے جن کا عنوان بنام "تعلیم" دلکش اور جن کا مقصد فی الحقیقت ایک ایسی جماعت تیار کرنا تھا جو "خون اور نسل کے اعتبار سے گو ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ کے اعتبار سے انگریز ہوں"۔ اس منصوبے پر پوری جدوجہد کیساتھ عملدرآمد کیا گیا اور ہر ممکن طور پر ہندوستانی نسل کو فکری و ذہنی اعتبار سے اتنا متاثر کر دیا گیا کہ وہ اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنے مذہب سے بتدریج بیگانہ ہوتی چلی گئی، اور ایسے ہندوستانی نوجوان تیار کئے گئے۔ جو کم از کم اخلاقی پابندیوں کے عادی اور زیادہ سے زیادہ فکری بے راہ روی کے خوگر ہوں، ان میں علم کا جو تھوڑا بہت شعور پیدا کیا گیا وہ مغربی علوم کی برتری و فوقیت کے احساس پر مبنی تھا۔ ان کو جتنا کچھ مہذب بنایا گیا اس میں مغربیت و فرنگیت کی نقالی کو اساسی حیثیت حاصل تھی، ان کی اجتماعی اور سیاسی تربیت جن خطوط پر

کی گئی وہ یکسر مفاد پرستی و خود غرضی کے تصورات پر مشتمل تھی۔

پچھلی ایک صدی میں ان ایمان کش اور ملت دشمن منصوبوں کے مقابلے میں دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور اس کے فضلا تعلیم و تدریس دعوت و تبلیغ، ارشاد و اصلاح اور تصنیف و تالیف کے ذریعے ہر محاذ پر ملت کو ان مذموم اثرات سے بچانے کی پیہم جدوجہد کرتے رہے۔

تو تعلیم و تدریس ہی ہے، اس لئے اس کا یہ فیض مدارس و مکاتب کی شکل میں ملک کے گوشے گوشے میں خود بخود پہنچتا رہا، اسی کے ساتھ تصنیف و تالیف کی عمومی اور دائمی افادیت کو بھی اکابر دیوبند نے ہر دور میں ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ تصنیف و تالیف کے میدان میں اکابر و اصاغر دیوبند کی خدمات آج کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں، ان کی مقبولِ عام کتب نے ملت اسلامیہ ہند کی بڑے پیمانے پر ذہنی و فکری تربیت کرنے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات خوش آیند ہے کہ عصرِ حاضر کے تصنیفی اور لٹریری ذوق کے وعندرس نتائج و اثرات کا عالمگیر جائزہ لینے کے بعد یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ جماعت دیوبند کے اس تصنیفی مزاج سے عصری تقاضوں کی روشنی میں زیادہ منظم طور پر باضابطہ کام لیا جائے تاکہ عوامی اصلاح کے ساتھ ساتھ فکر و تحقیق کے اس میدان میں بھی براہ راست پیش قدمی ہو سکے جہاں سے فاسد افکار و نظریات کے جراثیم پھوٹتے اور پھیلتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ عوام ہی نہیں بلکہ خواص تک ان سے متاثر و مانوس ہونے لگتے ہیں، اسی نقطۂ نظر سے آج کے حالات میں خصوصیت کے ساتھ یہ پہلو توجہ طلب بن کر سامنے آیا۔

بدلتی ہوئی دنیا ہر روز انسانی فکر و ذہن کو نئی نئی الجھنوں اور نئے نئے مسائل سے دوچار کر رہی ہے ملتِ اسلامی جو اس ہنگامہ پرور اور ہیجان انگیز تہذیب و تمدن کے سایے میں زندگی گذار رہی ہے جس کا ہر عنصر ایمانی تقاضوں کی ضد اور جس کا ہر پہلو اسلامی طرزِ زندگی سے مختلف ہے، اس ملتِ اسلامیہ کی نگاہ آج پھر قرآن کریم سے براہ راست استفادہ و رہنمائی کی آرزو مند ہے ان حالات کا لازمی تقاضا تھا جو داعیہ بن کر من جانب اللہ قلب میں پیدا ہوا اور اس عنوان سے یہ ضرورت سامنے آئی کہ:

"دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو بالاستقلال اور براہ راست علمائے سلف و خلف کی حکیمانہ قرآنی تحقیقات کو مقبول اسلوب کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اور اس مقصد کے لئے ایسے صاحب ذوق نظر اہل قلم علماء کا تعاون حاصل کرے جو قدیم علوم میں رسوخ رکھنے کے ساتھ عصری

تقاضوں کے ادراک و بصیرت میں معتمد و ممتاز ہوں ۔

کام بہت اہم، مقصد بہت اونچا اور ذمہ داری جہاں بہت بڑی تھی وہیں اس دورِ قحط الرجال میں مردانِ کار کی کمیابی کا احساس بھی تھا، لیکن دارالعلوم دیوبند کا فیضانِ علمی ڈھارس بندھانے میں پیش پیش رہا۔

چنانچہ رجب ۱۳۸۳ھ میں مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے اپنے اجلاس میں خدمتِ قرآن کی اس پیشکش کو منظور کیا۔

مجلسِ شوریٰ کی اس تجویز اور فیصلے کے بعد حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس قرآنی ادارے کے قیام کے سلسلے میں عملی پیش رفت کے لئے پوری توجہ اور التفاتِ خصوصی سے کام لیا اور ابتدائی طور پر آغازِ کار شوال ۱۳۸۳ھ میں اساتذۂ دارالعلوم کے ایک اجتماع میں فرمایا۔ اور بانیٔ دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی ایک نادر قرآنی تحقیق کو اردو سے عربی میں منتقل کرنے کی خدمت اس قرآنی ادارے کے تحت دارالعلوم کے ایک صاحب استعداد فاضل مولوی عمید الزمان صاحب کے سپرد فرمائی؛ موصوف اس ترجمہ کو تدریجاً کرتے رہے۔ لیکن اس سال میں صدر مجلس معارف القرآن حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ مہتمم دارالعلوم کے طویل اسفار، کثرتِ کار اور اخیر سال میں حضرت مدظلہٗ کی علالت کے سبب تصنیفی یا انتظامی کاموں میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی، جب کہ حضرت محترم کے فکر و نظر پر بنیادی اعتماد ہی اس کے قیام کا بھی بنا تھا، تو غیر معمولی اعذار کی وجہ سے آنمحترم کی رہنمائی کے بغیر کوئی اقدام ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ البتہ شوال ۱۳۸۴ھ میں اس ادارہ کو ایک باضابطہ ادارے کی صورت دے دی گئی۔ اور حقیقتاً اسی وقت مجلس معارف القرآن کا باضابطہ آغاز ہوا۔

چنانچہ اس ذیل میں حضرت صدر محترم مدظلہٗ العالی کی بصیرت مندانہ راہنمائی اور جناب مولانا حامد الانصاری غازی رکن مجلس منتظمہ مجلس معارف القرآن کے مفکرانہ مشوروں کے تحت ابتداءً قرآن مجید کی ایک خاص طرز کی خدمت پر مشتمل ایک تصنیفی خاکہ تجویز کیا گیا۔ یہ خاکہ قرآن کریم کی چودہ سو سالہ خدمات کا جائزہ تھا۔ یعنی ابتداء سے اس وقت تک اہلِ علم و تحقیق نے قرآن پر جو کچھ کام کیا اس کا مکمل تعارف کتابی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کا ایک عملی نقشہ ترتیب دیا۔ تصنیفی خاکے کے ابتدائی امور جس حد تک تکمیل طلب ہوتے ہیں۔ اس حد تک متہ

کام شروع کر دیا گیا۔

اس قرآنی جائزہ میں یہ پہلو خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا۔ کہ قرآنی علوم پر ہونے والی عالمگیر خدمات کی تفاصیل پوری وسعت نظر کے ساتھ یکجا کر دی جائیں۔ تاکہ اس جائزہ کی روشنی میں ملت کے ارباب علم و قلم اور اصحاب ارشاد و تبلیغ پوری بصیرت کے ساتھ یہ جان سکیں کہ کہ دنیا کے کون کون سے خطے میں قرآنی پیغام کو زبان یا قلم سے پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اور اس کی پیغام رسانی میں کن مؤثر و معقول تدابیر و وسائل کی کمی ہے جنہیں پورا کرنا ہے۔ اور ابھی کتنی قوموں اور کتنی زبانوں کو قرآن مجید کے مستند و مؤثر تراجم و تفاسیر کی ضرورت ہے۔

لیکن چونکہ قرآنی خدمات کے اس جائزہ کو زیادہ وقیع اور زیادہ ہمہ گیر بنانے کا داعیہ ابتداء ہی سے کارفرما تھا۔ اس لئے اس جائزہ کا تفصیلی خاکہ مسلسل غور و فکر اور ذہنی بحث و بریز کے تدریجی مراحل سے گزرتا رہا۔ اور آخرکار اس موضوع کی علمی وسعتوں نے ازسرنو اس تصنیفی خاکے کی ترتیب پر مجبور کر دیا۔ متعدد توجہ طلب تصنیفی گوشے سامنے آئے اور مزید افادی پہلوؤں کی رعایت سے نئے تصنیفی خاکے کی ترتیب شروع کی گئی، آخر کئی ماہ کی مسلسل محنت اور متعدد اہل علم کے مفید مشوروں کی روشنی میں ایک جامع "دائرۃ المعارف القرآنیہ" کا طویل الذیل خاکہ مرتب ہو گیا۔ جس میں ایک طرف تا بحد امکان خدمات قرآن کا چودہ سو سالہ مکمل علمی، تصنیفی اور تحقیقی جائزہ فراہم کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اور دوسری طرف اسکو قرآن کریم کے لفظ و معنی سے متعلق تمام علمی، ادبی، تفسیری، اصطلاحی موضوعات پر حاوی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز عصر حاضر کے پیدا کردہ ان تمام سوالات و شبہات کے جوابات پر مشتمل جامع مقالات و مضامین بھی اس میں رکھے گئے جو اسلامی عقائد اور قرآن کریم کے بارے میں عام طور پر پیش آتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے موجودہ نسل میں اسلامی تعلیمات پر یقین و اذعان کی جگہ شکوک و شبہات نے لے لی ہے، یہ دقیع و عظیم تصنیفی خاکہ کئی ماہ کی مسلسل محنت کے بعد موجودہ مرتب شکل اختیار کر سکا ہے۔ جس کے لئے یقیناً بصیرت مندانہ علمی و فکری جدوجہد کی ضرورت ہے، یہ تصنیفی خاکہ تا حال تقریباً سولہ ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب ایک اہم ترین کلیدی موضوع کا حامل ہے۔ پھر ہر باب کے تحت متعدد فصلیں اور ہر فصل میں متفرق ذیلی عنوانات رکھتی ہیں، یہ ابواب سو سے زائد فصلوں اور پانچ سو کے قریب ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب دیئے گئے ہیں۔

اس تصنیفی خاکے کا ہر باب بذات خود ایک مستقل کتاب کا موضوع ہے۔ اس لئے یہ

وقیع کار تصنیف ارباب علم و تحقیق کی اجتماعی عرق ریزی کا محتاج ہے، چنانچہ صدر محترم مجلس معارف القرآن کے ملاحظہ عالی سے گذارنے اور اسکی منظوری حاصل کرنے کے بعد اس تصنیفی خاکے کے مختلف ابواب ذوقی و علمی مناسبت کے پیش نظر مختلف ارباب قلم کے سپرد کئے گئے ہیں۔

اب حضرات مؤلفین متعلقہ عنوانات کا مواد فراہم کرنے اس کو ترتیب دینے اور اسکی تسوید میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ بات مسلم ہے۔ کہ فکر و تحقیق کے کسی منتخب معیار کے مطابق کسی طویل الذیل کار تصنیف کا پایہ تکمیل تک پہنچنا آسان بات نہیں ہے۔ اور اس کے تکمیل پذیر ہونے میں غیر ضروری عجلت بھی اختیار نہیں کی جاسکتی۔ اور نہ ایسا جامع تصنیفی خاکہ بیک وقت مکمل ہوسکتا ہے، اس لئے تصنیفی ترتیب کے ساتھ تیار شدہ مسودات مناسب ضخامت کی جلدوں پر منقسم ہو کر اشاعت پذیر ہوتے رہیں گے، چونکہ حضرات مؤلفین نے متعلقہ موضوع پر ۱۹۶۵ء کے ربع آخر میں قلم اٹھایا ہے۔ اس لئے مسودات کا صاف و خوش قلم لکھوانا اور پھر کتابت و طباعت کے طویل مراحل سے گذرنا خاصا وقت چاہتا ہے، اس لئے توقع ہے۔ کہ اس دائرۃ المعارف القرآنیہ کے کچھ کر اسے مجلس ۱۹۶۶ء میں شائع کر سکے گی۔

مجلس معارف القرآن اس کو مقصدی حیثیت دیتی ہے۔ کہ معاشرے کے ذہن کو عصر حاضر کے وساوس و خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے دعوتی و اصلاحی انداز کا لٹریچر عام فہم زبان اور متین و معقول لب و لہجے کے ساتھ پیش کیا جائے۔ چنانچہ اسی ذیل میں مجلس کی عرضداشت پر صدر مجلس مدظلہ العالی نے اپنی ایک اہم قرآنی تالیف کی تدوین و تہذیب پر کافی وقت صرف فرماکر مجلس کے سپرد فرمایا جسے عربی اور انگریزی زبان میں منتقل کر دیا گیا ہے، اب یہ ترجمہ کے مراحل سے گذر کر نظر ثانی کی منزل میں ہے، انشاء اللہ ۱۹۶۵ء کی کارگذاری کی شکل میں یہ اہم قرآنی تالیف بھی اردو، انگلش اور عربی میں سال ۱۹۶۶ء میں مجلس اہل نظر کی خدمت میں پیش کر سکے گی۔

پیش نظر "تصنیفی خاکے" کی روشنی میں تراجم و تفاسیر قرآن کی ایک تفصیلی یادداشت تیار کی گئی ہے۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے۔ کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اب تک قرآن کریم کے کتنے تراجم اور کتنی تفاسیر طبع ہو چکی ہیں، امکانی حد تک اس فہرست میں یورپ، ایشیاء اور افریقہ کی زبانوں میں تراجم و تفاسیر قرآن کریم سے متعلق معلومات فراہم کرانیکی سعی کی جارہی ہے۔

اس کے علاوہ حضرات اکابر دیوبند کی تصانیف کی فہرست سازی کی جارہی ہے۔ جس میں ہر موضوع سے متعلق الگ کتابوں کی ترتیب کی جارہی ہے۔ نیز اس فہرست کی روشنی میں تمام منتسبین دیوبند

باقی ص ۹ پر

سیّدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حکیمانہ اقوال

مرسلہ :- مولانا محمد یعقوب قاسمی، پشاور

★ ایک شخص نے آپ سے ایمان کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ایمان کا قیام چار ستونوں پر ہے۔ ۱۔ صبر ۲۔ یقین ۳۔ جہاد ۴۔ عدل۔

★ صبر کی بنیاد بھی چار چیزوں پر ہے۔ ۱۔ اچھی طرح سمجھنے پر ۲۔ کسی چیز کے ظاہر یا باطن کو دقت سے دیکھنے پر۔ ۳۔ حکمت پر ۴۔ حلم پر۔ جو شخص علم کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔ وہ اسکے ظاہر و باطن کو باریک نظر سے دیکھتا ہے۔ اور جو شخص علوم ظاہری اور باطن کو باریک نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ حکیمانہ باتیں کرتا ہے۔

★ جو شخص حلم اور بردباری اختیار کرتا ہے۔ وہ کبھی کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔ وہ لوگوں کے درمیان بطریق احسن زندگی بسر کرتا ہے۔

★ جو شخص جنّت کا خواہشمند ہے۔ وہ اپنے آپ کو شہوت میں مبتلا ہونے نہیں دیگا۔ جس کو دوزخ کا ڈر ہے۔ وہ محرمات سے پرہیز کرے گا۔

★ جو شخص دنیا سے رغبت نہیں رکھے گا۔ وہ مصائب و آلام کی پرواہ نہیں کریگا۔

★ جو شخص موت کا منتظر ہوگا۔ وہ نیکیوں کو سرانجام دینے میں عجلت سے کام لیگا۔

★ کفر کے بھی چار ستون ہیں۔ ۱۔ اوہام کا اتباع ۲۔ لڑنا جھگڑنا ۳۔ کجی ۴۔ مخالفت اور کجی۔

★ جو شخص اوہام کا اتباع کرتا ہے۔ اُسے حق کی جانب رجوع کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

★ جو شخص جہالت کی بناء پر لڑتا جھگڑتا ہے۔ اسکی نظریں حق و صداقت سے ہٹی رہتی ہیں۔

★ جو شخص کجی اختیار کرتا ہے۔ وہ نیکی کو برائی خیال کرتا ہے۔ اور برائی کو نیکی سمجھتا ہے۔ اور ضلالت و گمراہی کے نشہ سے مدہوش ہو جاتا ہے۔

★ آغاز سرما میں اپنے جسموں کی بخوبی حفاظت کرو۔ کیونکہ سردی جسموں پر وہی عمل کرتی ہے جو درختوں پر کرتی ہے۔ شروع میں انہیں جلا دیتی ہے۔ اور آخر میں انہیں جلا دیتی ہے۔

★ جو حق کا مقابلہ کرتا ہے۔ وہ بالآخر شکست کھا جاتا ہے۔

★ علم کے طالب اور مال کے طالب کبھی سیر نہیں ہوتے۔

تنقید و تعارف

فلسفۂ دعا

از پروفیسر فضل احمد عارف۔ ایم اے۔ ناشر مکتبۂ رشیدیہ محلہ منڈی منٹگمری۔ صفحات ۱۸۴۔ قیمت مجلد گرد پوش چار روپے، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔

دعا عبادات کی مغز اور شکستہ دلوں کے لئے سامان تسکین اور خالق و مخلوق کے درمیان ایک مضبوط رابطہ اور تعلق کا ذریعہ ہے۔ قدرت نے انسان کے خمیر میں سوز دروں احتیاج و التجا کی جو صفت رکھی ہے۔ اس کا اظہار دعا سے ہی ہوتا ہے۔ اس خدا فراموش دور میں مادہ پرستی کے شکار انسان کو دعا کی حقیقت اہمیت اور افادیت سے روشناس کرانا ایک مفید خدمت ہے۔ فاضل مصنف نے دعا کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ باب اوّل میں دعا کی حکمت اور افادیت پر کئی ذیلی عنوانات کے ضمن میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ علماء اسلام کے علاوہ دعا کے متعلق یونانی حکماء، مغربی اقوام اور دنیا کے دیگر کئی مشاہیر کے تاثرات بھی پیش کر دیئے ہیں۔ بعد کے ابواب میں اسلام کا تصور دعا، قبول دعا کے طریقے، قرآنی دعاؤں کے خصائص پھر قرآنی دعاؤں کے ضمن میں انبیاء کی دعائیں اور قرآنی دعاؤں کے فضائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ حق تو یہ ہے۔ کہ فاضل مؤلف نے موضوع کی جامعیت اور عظمت کا ہر طرح لحاظ رکھا ہے۔ اس کا ہر باب گنجینۂ معلومات ہے۔ اس موضوع کو جس تحقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ اس کتاب ہی کی خصوصیت ہے۔ اہل ذوق و شوق کے ذوقِ دعا میں اس کے پڑھنے سے اضافہ ہوگا۔ اور جن قلوب کو دعا کے بارہ میں شکوک و شبہات ہیں۔ وہ بھی دور ہو سکیں گے۔ اللہ تعالےٰ مؤلف کی اس محنت کو قبول فرما دے۔

حقیقتِ رمضان

از پروفیسر فضل احمد عارف۔ ناشر دار التصنیف و الاشاعت ۱۴۔ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

فلسفۂ دعا کے مؤلف نے اس رسالہ میں رمضان المبارک کی فضیلت اسکی تاریخی اہمیت، اس کے عبادات کی خصوصیت سے بحث کی ہے۔ رمضان کا مہینہ مومنین کے لئے بہار رحمت کا مہینہ ہے۔ اس کے اثرات مومن کی پوری زندگی پر پڑ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اسکی اہمیت، برکت، اور فضیلت کا صحیح اندازہ ہو جائے اور اس کتاب سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

ذکر اللہ اور درود و سلام کے فضائل و مسائل

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان صفحات ۹۲ طباعت و کتابت عمدہ قیمت ۵۰ پیسے۔

موضوع کی عظمت اور اہمیت کے علاوہ کتاب کی افادیت کے لئے حضرت مفتی صاحب موصوف مدظلہ کا نام نامی

کافی ہے۔ حضرت مفتی صاحب مدظلہ اس دور کے جید اور ممتاز عالم ہیں۔ اور فقہی مسائل میں ان کا مقام بلاشبہ فقیہ وقت کا ہے۔ دار العلوم دیوبند کے منصب افتار سے لیکر اب تک ان کا قلم قرآن و سنت کی اشاعت اور عصر حاضر کے حوادث و نوازل کی فقہی حیثیت اور مسائل جدیدہ کی اسلامی تشریح میں رواں دواں ہے۔ ذکر خداوندی اور صلوٰۃ و سلام کے موضوع پر ان کا یہ رسالہ نہایت جامع اور معلومات آفرین ہے۔

خبرنامہ طب (لاہور) | نگران حکیم عبدالرحیم اشرف زرتبادلہ سالانہ تین روپے۔ فی پرچہ بیس پیسے

مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف ایک فعال، حساس اور محنتی انسان ہیں۔ ان کا دل دردمند ہر وقت ملک و قوم کی خیرخواہی اور صحیح خدمت کیلئے تڑپتا رہتا ہے۔ ان کی نگرانی میں طبی جریدہ کا آغاز ایک مبارک امر ہے۔ خوشی یہ ہے کہ خبرنامہ طب کی نظر صرف جسم پر نہیں بلکہ روح پر بھی رہے گی۔ یعنی علم الابدان کو علم الادیان سے ہمکنار کرنا بھی عزائم میں شامل ہے۔ اور بقول مولانا اشرف صاحب یہ پرچہ ہر اس فکر و تصور سے برسرپیکار ہوگا، جو بنی نوع انسان کی روحانی اور جسمانی صحت کے لئے مضر ہوگا۔ یہ پاکیزہ مقصد پہلے شمارہ کے مندرجات میں جھلک رہا ہے۔ ہم ان پاکیزہ جذبات اور طبی مجلہ کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

ریاض الاذکار | از مولانا حافظ گوہر دین صاحب۔ ملنے کا پتہ :- طاہر سلیم۔ ترناب فارم۔ پشاور (قیمت درج نہیں) صفحات ۶۸

عبادات (نماز، اذان، وضو، حج، جنازہ وغیرہ) اور اعمال و افعال کے بارہ میں حضور اقدسؐ کی مسنون دعائیں معہ ترجمہ و تشریح بڑے سلیقہ سے جمع کی گئی ہیں۔ کتابچہ مختصر ہونے کے باوجود مسنون دعاؤں کا گنجینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف اور ناشر کو اس کا اجر اور مسلمانوں کو اس اہم عبادت دعا کی ادائیگی کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائیں —— فاضل مؤلف اہل حدیث مسلک رکھتے ہیں۔ اور بعض مقامات شلاً نماز جمعہ وغیرہ میں اپنے مسلک کی ترجمانی کی گئی ہے۔ کتاب مجموعی لحاظ سے مفید ہے۔

مادیت الحاد اور دین سے عمومی بیزاری اور دینی اقدار سے گریز و فرار کے اس ایمان سوز دور میں دار العلوم کی اہمیت اور ضرورت آپ پر مخفی نہ ہوگی اور نہ میں اس حقیقت کے اظہار کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ اس پرفتن ماحول میں دینی علوم اور اسلام کی حفاظت اور ترویج و اشاعت کی ضرورت کتنی بڑھ گئی ہے؟ دنیا کے نظریات اور حقائق بدل سکتے ہیں۔ تحریکیں ختم ہو سکتی ہیں۔ ثقافت اور کلچر رسوم و رواج بدلتے رہتے ہیں۔ مگر دار العلوم جس کا تعلق اسلام اور اسلامی علوم اور ذات رسالت مآبؐ، سنت کی احیاء اور اشاعت سے ہے۔ اسکی ضرورت اور اہمیت میں کسی لمحہ بھی کمی آنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اسلام ایک غیر فانی، غیر مبدل، عالمگیر اور ہمہ گیر نظام حیات ہے۔ تو جن مراکز سے اس شجرہ طیبہ مبارکہ اصلھا ثابتٌ و فرعھا فی السماء کی آبیاری ہوتی ہو اسکی شدید ضرورت میں کمی کا لمحہ بھر احساس بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ (شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب۔ مجلس شوریٰ مدرسہ سے خطاب)

مولانا سلطان محمود ناظم دفتر اہتمام

احوال وکوائف
دار العلوم حقانیہ

مجلس شوریٰ کا سالانہ جلسہ

دار العلوم حقانیہ کی مجلسِ شوریٰ کا سالانہ اجلاس (برائے منظوری سالانہ میزانیہ) ۲ر جمادی الاخریٰ ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۸ر ستمبر ۱۹۶۶ء بروز اتوار دار الحدیث میں منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت حضرت مولانا خان محمد صاحب مدظلہٗ خانقاہ سراجیہ کندیاں۔ (میانوالی) نے فرمائی۔ مولانا قاری محمد امین صاحب راولپنڈی اور مشرقی پاکستان کے ایک معزز مہمان کی تلاوتِ قرآنِ پاک کے بعد سب سے پہلے حسب ذیل افراد کے لئے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کے لئے فاتحہ خوانی کی گئی۔

۱۔ حضرت مولانا عبد الحنان صاحب ہزاروی رکن مجلسِ شوریٰ دار العلوم حقانیہ۔ ۲۔ حضرت مولانا عبد الرحمان صاحب کاملپوری۔ حضرت مولانا نجم الدین صاحب کلاچی۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھا۔ اہلیہ محترمہ حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہٗ اسیر مالٹا وتلمیذ خاص حضرت شیخ الہندؒ۔

اس کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحق صاحب مدظلہٗ نے دار العلوم کے مختلف شعبوں کی سالانہ کارگذاری اور حسابات آمد وخرچ پر مشتمل رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ اور سال گذشتہ ۱۳۸۵ھ کے میزانیہ کی تفصیلات پیش کیں۔ مدات میزانیہ میں اضافہ یا کمی پر روشنی ڈالی اور سالِ رواں ۱۳۸۶ھ کے لئے ایک لاکھ اٹھاون ہزار آٹھ سو پینسٹھ روپے کا میزانیہ پیش کیا۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب نے فرمایا کہ پچھلے سال ۱۳۸۵ھ دار العلوم کو مختلف مدات سے ایک لاکھ اڑتیس ہزار نو روپے چودہ پیسے (۱۳۸۰۰۹/۱۴) کی آمدنی ہوئی۔ اور پچانوے ہزار آٹھ سو پچاس روپے اڑتیس پیسے (۹۵۸۵۰/۳۸) تعلیمی شعبہ اور اٹھائیس ہزار چار سو دو روپے چون پیسے (۲۸۴۰۲/۵۴) تعمیری شعبہ پر مجموعہ ایک لاکھ چوبیس ہزار دو سو باون روپے بانوے پیسے (۱۲۴۲۵۲/۹۲) خرچ ہوئے۔

انہوں نے فرمایا کہ ۳۰ ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ کو دار العلوم کی تحویل میں موجودہ رقم کی رُو سے منظور شدہ نئے بجٹ میں ستر ہزار ایک سو ترپن روپے ستر پیسے کا خسارہ رہے گا۔

حضرت شیخ الحدیث نے بجٹ کی ایک ایک مد کے اخراجات کی کمی بیشی واضح کی اور تفصیلی

حسابات کو پیش کیا۔ تعلیمی شعبہ کی کارگزاری پیش کرتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب نے واضح کیا کہ پچھلے سال شعبہ پرائمری مدرسہ تعلیم القرآن میں حسب پروگرام چھٹی کلاس کا اضافہ کیا گیا اور ہر سال اس میں ایک ایک جماعت کا اضافہ ہوتا رہیگا انشاءاللہ تاکہ قوم کے بچے ہائی تک عصری تعلیم کے ساتھ کافی حد تک دینی علوم سے بھی آراستہ ہوسکیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس شعبہ کی پانچ کلاسیں جو چھ سیکشنوں پر مشتمل ہیں، نئی عمارت میں منتقل ہوچکی ہیں۔ اور اس سال ۱۳۹۶ھ سات ہزار روپے کی لاگت سے مزید دو کمرے تعمیر کیئے جا چکے ہیں۔ اور بقیہ دو کلاسیں اول و ادنیٰ کے لئے نئی عمارت میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے گاؤں میں مستقل عمارت کا انتظام کیا گیا ہے۔

شعبہ عربی دارالعلوم میں چار سو طلبہ داخل ہوئے جن میں ۶۳ طلبہ نے وفاق المدارس کی زیر نگرانی سالانہ امتحانات دیکر مجموعی لحاظ سے شاندار کامیابی حاصل کی۔ یہ تعداد وفاق سے ملحقہ تمام مدارس کے مجموعی طلبہ دورہ کے نصف کے برابر تھی۔ اس کے علاوہ شعبۂ قرأت و اردو خط و کتابت میں بھی کافی طلبہ شریک ہوئے۔ آئندہ ضروریات اور منصوبوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ اس وقت مسجد اور دارالاقامہ کی تکمیل اور مدرسہ تعلیم القرآن کی عمارت میں توسیع ایک مہمان خانہ اور کتب خانہ کے لیے مستقل عمارت ——— کی اہم ضروریات درپیش ہیں جن پر لاکھوں روپے لاگت کا تخمینہ ہے۔ جس کے لئے حضرت مہتمم صاحب نے اراکین اور دیگر معاونین کی توجہ دلائی۔ بجٹ پیش ہونے کے بعد اراکین نے حسابات آمد و خرچ اور دارالعلوم کے مختلف شعبوں کی رفتار ترقی پر مسرت و اطمینان کا اظہار کیا۔ غور و خوض کے بعد اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر بامید آمدنی نئے میزانیہ کی منظوری دی۔

بجٹ کے آغاز میں حضرت شیخ الحدیث نے دارالعلوم کے مخلص اور سرگرم رکن اور ملک کے ممتاز عالم خطیب حضرت مولانا عبدالحنان ہزاروی کے ملی و دینی خدمات کو سراہا اور ان کے سانحۂ وفات پر گہرے تاثرات کا اظہار کیا۔ حسب ذیل اراکین نے شرکت کی:۔

۱۔ مولانا مسرت شاہ کاکاخیل صاحب ۔ ۲۔ مولانا قاری محمد امین صاحب ۔ راولپنڈی۔ ۳۔ مولانا عبدالحنان صاحب جہانگیرہ ۔ ۴۔ جناب الحاج عطا محمد خان صاحب پشاور صدر۔ ۵۔ جناب الحاج میاں مراد گل کاکاخیل ۔ ۶۔ الحاج مولانا محمد ایوب جان صاحب بنوری پشاور۔ ۷۔ جناب میاں میر احمد گل صاحب چشتی ۔ ۸۔ میاں محمد اکرم شاہ صاحب کاکاخیل ۔ ۹۔ الحاج میاں غلام سرور شاہ کاکاخیل ۔ ۱۰۔ جناب شیر افضل خان صاحب بدرشی ۔ ۱۱۔ الحاج محمد اعظم خان صاحب

اکوڑہ خٹک۔ ۱۲۔ مولانا شاہ سید زڑہ میانہ۔ ۱۳۔ الحاج ڈاکٹر شاہ صاحب تمدڈھیر۔ ۱۴۔ مستقر صاحب پبّی۔ ۱۵۔ حکیم رفیع الدین نوشہرہ۔ ۱۶۔ مولانا قاضی عبدالسلام صاحب نوشہرہ۔ ۱۷۔ الحاج عبدالجبار صاحب لاہور۔ ۱۸۔ الحاج عبدالخالق صاحب خلیق پشاور۔

اس کے علاوہ حسب ذیل افراد نے بھی اعزازی طور پر شمولیت کی۔

۱۔ حاجی بشیر الدین بوگرہ (مشرقی پاکستان) ۲۔ مولانا عبدالحکیم صاحب مدرسہ فرقانیہ راولپنڈی۔ ۳۔ مولانا قاضی شمس الدین صاحب ہزارہ۔ ۴۔ مولانا حافظ محمد رمضان صاحب راولپنڈی۔ ۵۔ مولانا محمد یعقوب قاسمی پشاور۔ ۶۔ مولانا احمد عبدالرحمٰن الصدیقی۔ نوشہرہ۔ ۷۔ مولانا دوست محمد جلوزئی پبّی۔ ۸۔ مولانا نور الحق نور۔ پشاور۔ ۹۔ مولانا میاں عبدالحنان صاحب بارحسین۔ ۱۰۔ جناب وہاب الدین صاحب۔ پشاور ۱۱۔ جناب وارث خان صاحب پشاور۔

نقشہ ذرائع آمدنی دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک بابت سال ۱۳۸۵ھ / ۶۶-۱۹۶۵ء

			روپے
مقامی وبیرونی اراکین دار العلوم	۲۱	۳۶,۳۳۱	روپے
سفراء	۹۷	۴۳,۰۹۷	
فضلاء	۱۲	۱,۵۵۲	
باغیچہ سے سبزی کی قیمت	۹۱	۹۸۹	
کرایہ لاؤڈ سپیکر	-	۵۰	
قربانی کی کھالوں کی قیمت	۴۴	۱,۸۴۴	
فیس سند فراغت	۵۰	۱۷۹	
مقامی ٹاؤن کمیٹی	-	۶,۹۰۰	
بر موقع عیدگاہ برائے تعلیم القرآن	-	۴۰۶	
معاوضات	۳۷	۵۳۴	
ماہنامہ الحق (از خریداراں)	۷۵	۳,۴۱۰	
بوساطت مہتمم دار العلوم حقانیہ (بذریعہ ڈاک یا خود)	-	۴۲,۲۷۰	
امانت	۸۰	۴۲	
میزان کل	۱۴	۱,۳۷,۹۰۹	

نقشہ تفاوت تخمینی اور واقعی مصارف بابت سال ۱۳۸۵ھ

نمبر شمار	مدات	تخمینی مصارف		واقعی مصارف		کمی		بیشی	
		پیسے	روپے	پیسے	روپے	پیسے	روپے	پیسے	روپے
۱	مطبخ	--	۳۱,۶۸۰	۸۸	۳۲,۳۰۱			۸۸	۶۲۱
۲	کتب	--	۱,۰۰۰	۳۸	۹۳۳	۶۲	۶۶		
۳	سٹیشنری	--	۳۰۰	۷۷	۲۷۰	۲۳	۲۹		
۴	ڈاک	--	۱,۲۰۰	۱۲	۱,۰۴۷	۸۸	۱۵۲		
۵	امتحانات	--	۱۴۰	۵۳	۱۳۶	۴۷	۳		
۶	تنخواہ مع الاؤنس	--	۳۲,۸۶۰	۶۰	۳۲,۵۵۳	۴۰	۳۰۶		
۷	کرایہ مکانات	--	۹۰۰	۵۰	۷۲۰	۵۰	۱۷۹		
۸	نقد امداد	--	۳۰۰	۲۱	۳۲۸			۲۱	۲۸
۹	صابن	--	۵۰۰			--	۵۰۰		
۱۰	تبلیغ	--	۲۰۰	۲۵	۲۰۱			۲۵	۱
۱۱	روشنی فلنگ	--	۱,۸۰۰	۳۷	۱,۶۷۴	۶۳	۱۲۵		
۱۲	اشاعت رسائل و اخبارات	--	۹۰۰	۴۷	۹۱۶			۴۷	۱۶
۱۳	سفارت	--	۱۰,۰۰۰	۷۷	۱۰,۵۰۹			۷۷	۵۰۹
۱۴	تعلیم القرآن (مرمت وغیرہ)	--	۸,۴۰۰	۵۶ ۸۶	۷,۹۳۳ ۷۰۱	۵۸	۷۶۴		
۱۵	سامان	--	۸۰۰	۸۱	۷۶۷	۱۹	۳۲		
۱۶	متفرق	--	۱۵۰	۱۷	۱۸۵			۱۷	۳۵
۱۷	مرمت واٹر پمپ	--	۳۰۰	۳۶	۵۵	۶۴	۲۴۴		
۱۸	تعمیر دارالاقامہ	--	۸,۰۰۰	۵۳	۲,۹۲۸	۴۷	۵,۰۷۱		
۱۹	تعمیر مسجد	--	۱۷,۰۰۰	۳۳	۲۴,۷۵۱			۳۳	۷,۷۵۱
۲۰	مرمت تعمیرات	--	۱۰۰	۸۱	۲۰	۱۹	۷۹		
۲۱	آڈٹ حسابات	--	۱۵۵	--	۱۵۵				
۲۲	فیس وفاق	--	۴۰۰	--	۴۰۰				
۲۳	مرمت لاوڈ سپیکر	--	۵۰	۳۱	۳۹	۶۹	۱۰		
۲۴	باغیچہ	--	۱۵۰	۲۵	۳۷۰			۲۵	۲۲۰
۲۵	سالانہ جلسہ	--	۸,۰۰۰			--	۸,۰۰۰		
۲۶	الحق			۰۷	۳,۸۴۹			۰۷	۳,۸۴۹
۲۷	بنک کمیشن			--	۱			--	۱
۲۸	خرید لاوڈ سپیکر			--	۱,۵۰۰			--	۱,۵۰۰
		--	۱۲۵,۲۸۵	۹۲	۱۲۲,۲۵۲	۲۹	۱۵,۵۶۶	۲۱	۱۲,۵۳۳

نقشہ منظور شدہ میزانیہ برائے سال رواں ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶-۶۷ء

نمبر شمار	مدات		رقم	کیفیت
۱	مطبخ	--	۳۵,۶۴۰	۲۲۰ طلبہ کیلئے کھانا بحساب -/۱۸ روپے فی کس ۹ ماہ کیلئے۔
۲	کتب	--	۱,۱۰۰	دورۂ حدیث کی کثرت جماعت کیوجہ سے مزید کتب حدیث
۳	امتحانات	--	۱۳۰	
۴	سٹیشنری	--	۴۰۰	
۵	نقد امداد	--	۳۰۰	
۶	صابن	--	۵۰۰	
۷	روشنی و فٹنگ	--	۱,۸۵۰	دارالاقامہ کے ۳ کروں اور صدر دروازہ مسجد میں فٹنگ وغیرہ
۸	تبلیغ	--	۲۰۰	
۹	ڈاک	--	۱,۲۰۰	حسب اخراجات سال سابق مع اضافہ شرح ڈاک
۱۰	ماہنامہ الحق	--	۷,۰۰۰	چھپائی، کاغذ، کتابت وغیرہ
۱۱	سفارت	--	۱۰,۵۰۰	حسب اخراجات سال سابق۔
۱۲	تنخواہ معہ الاؤنس	--	۳۴,۴۰۰	حسب اخراجات سال سابق مع اضافہ تنخواہ وغیرہ
۱۳	کرایہ مکانات	--	۴۵۰	حسب اخراجات موجودہ
۱۴	اشاعت	--	۹۲۰	اشاعت اپیل برائے امداد، اشاعت روئیداد وغیرہ
۱۵	تعلیم القرآن	--	۸,۴۰۰	
۱۶	سامان	--	۱,۰۰۰	چارپائیاں، تپائی، برتنوں کی مرمت وقلعی نیز سائیکل برائے دفتر۔
۱۷	متفرق	--	۲۰۰	
۱۸	مرمت واٹر پمپ	--	۲۶۰	
۱۹	مرمت لاؤڈ سپیکر	--	۵۰	حسب اخراجات مع معمولی اضافہ
۲۰	باغیچہ	--	۳۰۰	" " کھاد، تخم، ہل وغیرہ کے اخراجات
۲۱	فیس وفاق المدارس	--	۴۱۰	
۲۲	آڈٹ حسابات	--	۱۵۵	
۲۳	تعمیر مسجد	--	۲۵,۰۰۰	مسجد کے دروازے، کھڑکیاں، روشندان، شیشے، پلستر وغیرہ۔
۲۴	تعمیر دارالاقامہ	--	۱۲,۰۰۰	
۲۵	تعمیر تعلیم القرآن	--	۷,۰۰۰	
۲۶	مرمت تعمیرات	--	۱,۵۰۰	رنگائی، سفیدی، اور شکستہ دیواروں اور سیڑھیوں کی مرمت۔
۲۷	سالانہ جلسہ بشرط انعقاد	--	۸,۰۰۰	
	میزان کل۔	--	۱,۵۸,۸۶۵	

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کی اجمالی کارگزاری اور اہل خیر سے پُرزور اپیل

اکوڑہ خٹک دارالعلوم حقانیہ اسلامی تعلیم و تربیت کی پاکستان میں بین الاقوامی درس گاہ ہے جو مادیت اور الحاد مغربی تہذیب اور دینی و اخلاقی فتنوں کے اس طوفانی دور میں اسلامی دماغ و فکر کی بلندی پر عرصہ انیس سال سے مذہبی علوم و فنون کا پرچم لہرا رہی ہے۔ اس نشرگاہ علوم رسالت سے جو دینی خدمات درس و تدریس وعظ و تبلیغ افتاء و تصنیف وغیرہ انجام پارہے ہیں۔ وہ اکثر مسلمانوں سے مخفی نہیں۔ اس مختصر عرصہ میں اس کے علمی انوار و برکات سے ملک کا گوشہ گوشہ منور ہوا جو محض حق تعالےٰ کا فضل اور معاونین واراکین کی مخلصانہ توجہات اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور آج بفضلہٖ تعالیٰ تحدیثاً بالنعمت اس مدرسہ کو پاکستان کے واحد مثالی دارالعلوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اور اسکی حسن کارکردگی کی بدولت سرحد ملحقہ ریاستوں اور پاکستانی افواج میں دارالعلوم کی سند فراغت منظور کی گئی ہے۔

مختصر تعارف ـــــ بعض شعبوں کا اجمالی تعارف یہ ہے۔ شعبۂ تعلیم القرآن لوئر مڈل جو عرصہ تیس سال سے مسلمان بچوں کو عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن مجید عربی اور دینی ضروریات کی تعلیم دے رہی ہے۔ اس شعبہ میں پانچسو بچے دس اساتذہ کی نگرانی میں تعلیم پارہے ہیں۔ بحمد اللہ یہ شعبہ اپنی نئی عمارت میں منتقل ہوا ہے۔ اور اس سال اسے چھٹی کلاس تک ترقی دی گئی ہے۔ آئندہ اسے ہائی تک بڑھانے کی تجویز ہے۔

شعبۂ دارالعلوم ـــــ اس شعبہ میں پاکستان اور ریاستہائے ملحقہ آزاد قبائل افغانستان تک کے تقریباً چارسو طلباء گیارہ جید ممتاز علماء سے اسلامی علوم و فنون حاصل کر رہے ہیں۔

شعبۂ افتاء ـــــ اس شعبہ کا کام ملک بھر سے آئے ہوئے اہم دینی مسائل کے جوابات دینا ہے۔ اب تک تقریباً ساڑھے چھ ہزار فتاویٰ جاری ہو چکے ہیں

شعبۂ تبلیغ و اشاعت ـــــ اس شعبہ میں حضرات مدرسین بوقت ضرورت بسلسلہ وعظ و تبلیغ باہر تشریف لے جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ایک عظیم تبلیغی جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ مختلف رسائل پمفلٹ اور مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک علمی و تبلیغی اور اصلاحی ماہوار رسالہ الحق کے نام سے شائع ہو رہا ہے، جو ملک و بیرون ملک میں ملت مسلمہ کی دینی راہبری اور تعلیمات قرآن و سنت کی پرچار کر رہا ہے۔

شعبۂ حفظ القرآن والقراۃ ـــــ اس شعبہ کو انشاء اللہ العزیز مزید توسیع و ترقی دی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ اردو خط و کتابت، امتحانات، انتظامات، تعمیرات کتب خانہ، مطبخ وغیرہ کے الگ الگ شعبے نہایت جانفشانی سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

اخراجات ـــــ دوسو ساٹھ طلبہ کے طعام اور تمام طلبہ کے دیگر ضروریات قیام، روشنی،

ادویات، صابن، کتب اور مصارف امتحانات دارالعلوم کے ذمہ ہیں۔ سالِ رواں کے لازمی اخراجات کا میزانیہ ایک لاکھ اٹھاون ہزار آٹھ سو پینسٹھ روپے ہے (۱۵۸۸۶۵)۔ جسکی منظوری ایک با اختیار مجلسِ شوریٰ دیتی ہے۔ جبکہ آمدنی کے لحاظ سے اس میں خسارہ ہے۔ امید ہے۔ کہ فضلِ خداوندی اور اربابِ خیر کی توجہ فرمانے سے دارالعلوم کی تعلیمی و تعمیری شعبوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ یہ خسارہ پورا ہو کر یہ دینی مرکزی ادارہ ملّتِ اسلامیہ کی اہم دینی ضرورتوں کو انجام دے سکے گا۔

تعمیرات کی فوری ضروریات —— دارالعلوم کو فوری طور سے دارالاقامہ (ہاسٹل) جامع مسجد کی تکمیل، دارالافتاء، کتب خانہ اور ایک مہمان خانہ مدرسہ تعلیم القرآن کی عمارت کی توسیع کی شدید ضرورتیں درپیش ہیں۔ جنہیں تو کلاً شروع کیا گیا ہے۔ مگر ان پر کم از کم پانچ لاکھ روپے لاگت کا تخمینہ ہے۔

دردمند اہلِ خیر مسلمانوں سے پرزور استدعا ہے۔ کہ اس نشرگاہِ علوم کی ضروریات کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔ اور اپنے حلقۂ احباب کو بھی متوجہ کرائیں۔ نیز اپنی پاک کمائی سے زکوٰۃ صدقات خیرات، چرمِ قربانی کے علاوہ خالص عطیات سے فیاضانہ طور سے اعانت فرمائیں۔ کیونکہ خالص عطیہ ہی ایک ایسا چندہ ہے۔ جس سے دارالعلوم کے ہر شعبہ کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ اور اسکی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ زکوٰۃ خیرات کی رقم صرف نادار اور غریب طلبہ پر صرف کی جاتی ہے۔

ضروری نوٹ :—— دارالعلوم کو رقم پہنچنے پر پختہ رسید مہتمم دارالعلوم کی دستخطی فوراً روانہ کر دی جاتی ہے۔ رسید نہ پہنچنے کی صورت میں دفتر کو مطلع کیا جائے۔ اگر کوئی رقم زکوٰۃ، صدقات یا کسی خاص مد میں بھیجی جائے تو اسکی تشریح کر دی جائے۔ ایسی مدات کو اپنے خاص مصارف میں خرچ کرنے کا خاص اہتمام کر دیا جاتا ہے۔ مرکزی حکومت پاکستان کی وزارتِ مالیات کے ریونیو ڈویژن نے رجسٹریشن نمبر (۹۰-سی ۷۱) ۳۶ آئی ٹی پی / ۵۵ کے ذریعہ دارالعلوم کو دئیے ہوئے عطیات انکم ٹیکس سے معاف کر دئیے ہیں۔

ترسیلِ زر کا پتہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب مہتمم
دارالعلوم حقانیہ۔ اکوڑہ خٹک

ضلع پشاور

ماہنامہ الحق معاصرین کی نظر میں

ہندوستان کا قدیم اور مشہور اخبار اور جمعیۃ العلماء ہند کا ترجمان روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی اپنے سنڈے ایڈیشن مجریہ ۴ ستمبر صفحہ ۶ پر رقمطراز ہے :-

"حضرت مولانا عبدالحق صاحب اور ان کے رفقاء مستحق مبارکباد ہیں۔ کہ جسطرح یہ حضرات اکوڑہ خٹک پشاور میں دارالعلوم حقانیہ جیسا علمی مرکز قائم کر کے سینکڑوں تشنہ لبوں کو علم موتی کے آب حیات سے سرشار کر رہے ہیں جسطرح وعظ و تذکیر کے ذریعہ حفاظت دین اور اشاعت علوم نبوت کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ ایسے ہی اپنی تصنیفی اور صحافی صلاحیتوں کے ذریعہ بھی اشاعت علم اور افاضہ و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ "ماہنامہ الحق" ان حضرات کے اس ہمہ گیر جذبہ کی متحرک تصویر ہے۔ اس رسالہ کے چند نمبروں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ بیشک یہ رسالہ دور حاضر کے مطلق العنان جدت پسندوں کیلئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتا۔ لیکن امت خیر الورٰی صلی اللہ علیہ وسلم کے جن اصلاح پسندوں اور سچے ہمدردوں کی فرمائش پر سے عالم انسانیت سے یہ ہے ___ کہ ہٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو ___ ان کے لئے یہ رسالہ تسکین حیات ہے۔ جو علمی جواہر پاروں سے آراستہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ علم دوست حضرات کو توفیق بخشے کہ وہ اسکی پوری پوری قدر کریں۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔ غیر ممالک سے ۱۶ شلنگ۔"

برِصغیر کی سب سے بڑی دینی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کا آرگن ماہنامہ دارالعلوم (ستمبر ۱۹۶۶ء) کے شمارہ میں رقمطراز ہے :-

"رسالہ الحق مغربی پاکستان کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم حقانیہ کا علمی، دینی ترجمان ہے۔ جس نے متنوع مضامین، جدت ترتیب، حسن کتابت و طباعت اور اپنے اعلیٰ نظریات کے لحاظ سے اپنا نیا معیار قائم کیا ہے۔ پاکستان اسوقت اردو صحافت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور وہاں سے ایسے علمی، دینی، ادبی اور فنی رسائل و اخبارات بڑی کثرت سے شائع ہو رہے ہیں، جو اپنے ٹھوس مضامین اور ظاہری آرائش و ترتیب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن ان رسائل و جرائد میں الحق کا بھی ایک مخلص مقام ہے۔ ہمارے بزرگ مولانا عبدالحق صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ کے فرزند گرامی مولانا سمیع الحق صاحب نے الحق کے اجراء اور اسکی ادارت سے صحافت و ادب کے میدان میں اپنی خاص صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ ہم اس ہونہار جریدہ کی طوالت عمر اور شاندار مستقبل کے خواہاں اور اہل ذوق سے اسکی خریداری اور اعانت کی پرزور سفارش کریں گے۔ حلقۂ اہل علم نے ایسے جرائد کی حوصلہ افزائی کی تو انشاء اللہ پاکستان میں دینی نظریات اور اقدار اسلامی کو بڑی مدد ملے گی۔"